

جہانِ مہ و پروین

پروفیسر شیخ محمد اقبال

جہانِ مہ و پرویں

مُصنّف

پروفیسر شیخ محمد اقبال

ایم اے انگلش، ایم اے اُردو۔ ایم فل۔
ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ انگریزی گورنمنٹ کالج
سرگودھا
صدر، پاکستان ایسوسی ایشن آف دی بلائنڈ
ضلع سرگودھا

اشاعتِ اوّل ________ ۱۹۹۷ء
تعداد ________ ۵۰۰
طابع ________ ثنائی پریس، سرگودھا
قیمت ________ -/۵۰ روپے
خطاطی ________ شاہد محمود انجم
سرورق ________ محمد انیس مغل
کمپوزنگ ________ نیو سرگودھا کمرشل اینڈ کمپیوٹر کالج، سرگودھا
ملنے کا پتہ ۱۳۱ - رحمت پارک کالج روڈ، سرگودھا

شائع شدہ کتب

۱۔ ساحلِ تشنہ لب (شعری مجموعہ)
۲۔ سوالیہ نشان (شعری مجموعہ)
۳۔ جون ڈن، شخصیت اور شاعری (تنقید)
۴۔ ذوقِ تماشا (نثر)

زیرِ طباعت کتب

۱۔ اِک ہم سفر اچھا لگا (شعری مجموعہ)
۲۔ رومانی انگریزی شعراء کے علامہ اقبالؒ پر اثرات
۳۔ اقبال بحضور اقبالؒ (مضامین)
۴۔ تلاوتِ دل (نعتیہ مجموعہ)

اِنتساب

ایک امریکی نابینا خاتون

آنجہانی ایزابل ایل ڈی گرانٹ

کے نام

جس نے

پاکستان میں نابینا افراد کی

تحریک کی بنیاد رکھی اور دورانِ

طالب علمی میری بہت راہنمائی کی،

حرفِ آغاز

کچھ افراد اور نظریات مہ و انجم کی طرح مطلعِ قلب و ذہن پہ ایسی روشنی بکھیرتے ہیں کہ پُورا وجود جگمگا اٹھتا ہے۔ راتیں لاکھ گھٹا ٹوپ ہوں، دِن ہزار بے نُور ہوں یہ اُجالے روشن تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ قویٰ آرزو کو کبھی مضمحل ہونے نہیں دیتے کشتِ حیات میں عزائم کی نت نئی کھیتیاں اِنہی کے دَم سے لہلہاتی ہیں جب کبھی شمعِ زندگی کی لو کچھ دھیمی ہونے لگتی ہے تو اُجالوں کے یہ چشمے یک بیک پھوٹ پڑتے ہیں۔

ہیلن کیلر اور لوئی بریل کی شخصیات اور ان کی فقید المثال جدوجہد کی کہانیوں کی کوکھ سے بعینہٖ ایسے اُجالے جنم لیتے رہیں گے۔ میں نے اِن ہر دو افراد کی جدوجہد کی کہانیاں تحریر کرنے کی حقیر سی کوشش کی ہے اور اس طرح اجالوں کو خراجِ تحسین ادا کرنے کی بھی سعی کی ہے ہیلن کیلر کی تصنیف THE STORY OF MY LIFE اور لوئی بریل

پر MARGRET DAVIDSON کی تصنیف
LOUIS BRAILLE THE BOY WHO INVENTED BOOKS
"FOR THE BLIND" بالخصوص پیش نظر رہی ہیں۔ اس ضمن میں میں نے کچھ اور دستیاب کُتب کا بھی مطالعہ کیا ہے اور پھر ان کی شخصیات کو اپنے جذب و احساس کی کسوٹی پر پرکھا ہے اور یوں میں نے خود اپنے بعض گوشوں کو روشن کرنے کی تدبیر بھی نکالی ہے۔ ان کہانیوں کی اشاعت سے بینا اور نابینا حضرات بیک وقت تحریک حاصل کر سکتے ہیں اور اس طرح اپنے کمزور لمحوں کو توانا بنا سکتے ہیں۔

کتاب کی اشاعت اور طباعت میں مجھے اپنے احباب سید نسیم الغنی۔ محمد اسحق کُنڈ۔ پروفیسر محمد اشرف شاہین اور شاہد اسلام دانش کا بھرپور تعاون حاصل رہا ہے جس کے لیئے میں اِن کا ممنون ہوں۔ میری کوشش ہوگی کہ آئندہ بھی باہمت افراد کی کاوشوں کو قارئین کی نذر کرتا رہوں۔

پروفیسر شیخ محمد اقبال

۱۴؍ اگست ۱۹۹۷ء

فہرست



باب اوّل

ہیلن کیلر

بعض افراد کی زندگی آفاقی اہمیت کی حامل ہوتی ہے اور یہ وہ افراد ہوتے ہیں جو معیار متعین کرتے ہیں ہر شعبہ حیات میں چند ایک ایسی شخصیات مل جاتی ہیں جو تحریک کا باعث بنتی ہیں۔ زندگی مسلسل جدوجہد کا نام ہے انسان اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود کچھ ایسی فطری رکاوٹوں سے دوچار ہوتا ہے جس کے لئے اسے غیر معمولی حوصلے اور تگ و تاز کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ ایسی مشکلات ان کی صلاحیتوں کو جلا عطا کرتی ہیں۔ ایسی شخصیات میں ایک شخصیت "ہیلن کیلر" کی ہے جس کی جدوجہد کی کہانی مختصراً سپرد قلم کرنے کی جسارت کی جارہی ہے۔

ہیلن کیلر 27 جون 1880 ء میں شمالی ایلاباماں کے ایک چھوٹے سے قصبے میں پیدا ہوئی۔ اس کے خاندان کا تعلق سوئٹزرلینڈ سے تھا جو کہ بعد میں میری لینڈ میں آ بسا۔ اس کے چچا نے ایلاباما (امریکہ) میں زمین خریدی اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ اس کی دادی کا تعلق ایک متمول خاندان سے تھا ہیلن کیلر کا والد آرتھر کیلر فوج میں کپتان تھا۔ اس کی ماں آرتھر کی دوسری بیوی تھی۔ وہ اس سے عمر میں بہت چھوٹی تھی۔ اس کی والدہ کا چچا چارلس ایڈمز امریکہ کی جنگ آزادی میں جنوب کی ریاستوں کی طرف سے لڑا اور بریگیڈئیر جنرل کے عہدے تک پہنچ گیا مگر ہیلن کیلر کی پیدائش ایک چھوٹے عمدہ سے مکان میں

ارضی سے کم نہیں گردانتی تھی۔ جب کبھی ہیلن ناراض ہو جاتی تو باغ میں چلی جاتی اور اپنا منہ پتوں میں چھپا لیتی اور سارا غصہ کافور ہو جاتا۔ اسے پتوں اور پھولوں سے بے پناہ محبت ہو گئی تھی اور خوشبوئیں اس کے ذہن میں رچ بس گئی تھیں۔

ہیلن کی زندگی کا آغاز بہت سادگی سے ہوا۔ وہ اپنے ماں باپ کا پہلا بچہ تھی۔ اس لئے اسے ڈھیروں پیار ملا۔ شروع ہی سے ہیلن کچھ خود سر ضرور تھی۔ طبیعت قدرے سیمابی پائی تھی جو کچھ وہ دیکھتی نقالی کی بے حد کوشش کرتی۔ ابھی وہ چھ مہینے کی تھی کہ لفظ اس کے ہونٹوں پر آنے لگے تھے۔ وہ Tea ۔Tea-Tea بڑے صاف انداز سے کہنے لگی وہ Water بھی آسانی سے کہہ لیتی۔ ابھی وہ سال ہی کی تھی کہ چلنے پھرنے لگی۔

ہیلن کی زندگی کا آغاز خوشیوں کی جھولیوں میں ہوا۔ ہر کوئی اس سے پیار کرتا تھا لیکن یہ خوشیاں زیادہ دیر قائم نہ رہ سکیں۔ وہ بیمار پڑ گئی جس سے اس کی بینائی اور سماعت جاتی رہی۔ اس بیماری کا تعلق معدے اور دماغ سے تھا۔ معالجین کا تو خیال یہاں تک تھا کہ شاید ہیلن جانبر ہی نہ ہو پائے لیکن وہ صحت یاب ہو گئی مگر بینائی اور سماعت جاتی رہی۔

ہیلن کی عمر ابھی صرف 19 ماہ کی تھی اس کی ماں نے انتہائی پیار سے اس کی پرورش جاری رکھی۔ ہیلن ہاتھوں سے اشیاء اور حرکات کو محسوس کرنے کی ہر ممکن سعی کرتی اور اس نے بہت سی چیزوں کی شناخت بھی کر لی۔ وہ دوسروں سے کچھ کہنا چاہتی تھی، باتیں کرنا چاہتی تھی لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ کچھ علامات اور اشارات کی مدد سے اپنا مافی الضمیر بیان کرنا چاہتی۔ نہیں کہنا ہوتا تو زور سے سر ہلا دیتی اور ہلکا سا سر ہلانے کا مطلب "ہاں" ہوتا جب وہ کھینچتی تو بلانا چاہتی۔ جب دھکیلتی تو جانے کے لیے کہہ رہی ہوتی۔ جب وہ روٹی مانگنا چاہتی تو وہ روٹی کو کاٹنے کی نقالی کرتی اگر اسے آئس کریم کی ضرورت ہوتی تو وہ فریزر کھولنے کا انداز اختیار کرتی اور کچھ کانپنے لگتی۔ اسے اپنی ماں کے بھی اشاروں کا

اندازہ ہونے لگا تھا کہ وہ کس طرح اسے کچھ لانے کے لئے کہتی تھی۔ اور وہ کس طرح سیڑھیوں پر چڑھنے اور اترنے کے لئے کہتی اور یہ سب کچھ انتہائی محبت سے ہوتا تھا۔ یوں اپنے گردوپیش کے بارے میں اسے بہت کچھ معلوم ہونے لگا تھا۔ جب وہ پانچ سال کی تھی تو دھل کر آئے ہوئے کپڑوں کو لپیٹ لیتی اور اپنے کپڑوں کی شناخت بھی کر لیتی اسے معلوم ہو گیا تھا کہ کہیں جاتے وقت اس کی امی اور خالہ کس طرح کے کپڑے پہنتی ہیں اور وہ ان کے ساتھ جانے کے لئے مصر ہوا کرتی۔ جب کوئی ملنے آتا تو اسے بلا لیا جاتا اور ان کے جاتے وقت وہ اپنا ہاتھ ہلا کر الوداع کہتی۔ اسے شور کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو جاتا اور وہ اس کا اظہار بھی کرتی۔ جب کوئی آنے والا ہوتا تو وہ لباس بدلتی۔ آئینے کے سامنے کھڑی ہو جاتی اپنے بالوں پر تیل لگاتی اور اس طرح وہ سب کچھ کرتی جو اپنے دیگر اہل خانہ کو کرتے ہوئے محسوس کرتی تھی۔ اسے کچھ محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ دوسروں سے مختلف ہے اور یہ کہ وہ اشاروں سے کام لیتی ہے۔ جب کہ دوسرے ایسا نہیں کرتے۔ دوسرے منہ سے کام لیتے ہیں کبھی کبھی وہ دو اشخاص کے درمیان کھڑی ہو جاتی اور ان کے ہونٹ چھو کر دیکھتی لیکن کچھ سمجھ نہ پاتی وہ اپنے ہونٹ بھی ہلاتی اور بڑی مضطرب ہوتی کبھی کبھی چیخ پڑتی۔ ہیلن بڑی شریر نٹ کھٹ بچی تھی کبھی کبھی وہ اپنی نرس ایلا (Ella) کو تنگ کیا کرتی اور پھر اسے اس کا افسوس بھی ہوا کرتا لیکن یہ افسوس وقتی ہوتا۔ شرارتیں اس پر پھر غالب آ جاتیں۔ ان کے خانساماں کی بیٹی مارتھا بھی ان کے گھر آیا جایا کرتی تھی اور مارتھا اس کے ساتھ باتیں کیا کرتی۔ مارتھا اس کی ہر بات مان لیتی جس سے ہیلن کو بڑی خوشی ہوتی۔ ہیلن بڑی چست اور توانا بچی تھی اور بہت کم آرام سے بیٹھ سکتی۔ باورچی خانے میں چلی جاتی مختلف چیزوں کو چھو کر دیکھتی۔ کبھی گھر کے پرندوں کے ساتھ دل بہلاتی۔ پرندے گھاس میں اپنے انڈے چھپا دیا کرتے اور ہیلن کو بڑا اچھا لگتا۔ جب وہ انہیں تلاش کر

لیتی۔ جب اس کے دل میں یہ خواہش بیدار ہوتی تو وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو زمین پر رکھ دیتی اور مارتھا سمجھ لیتی کہ وہ انڈوں کو تلاش کرنا چاہتی ہے۔ کبھی کبھی وہ اصطبل میں چلی جاتی اور کبھی وہاں جہاں گوالے دودھ دوہیا کرتے۔ اسے گائے کو ہاتھ سے چھونا بڑا اچھا لگتا۔ وہ دو تین سال کی تھی کہ مارتھا کے ساتھ مل کر جو کہ پانچ چھ سال کی تھی کاغذ کی گڑیا بنایا کرتی۔ وہ اپنی کتیا (Belle) بیل کے ساتھ بھی بڑی مانوس تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ کتیا بھی اس کے اشارات سمجھنے لگے۔ لیکن کتیا بڑی سست ذہن تھی۔ ہیلن تنگ آ کر اسے مارنے لگتی۔ ایک دن گیلے ایپرن کو آگ کے سامنے خشک کرنے لگی لیکن وہ جلدی خشک نہ ہوا۔ اس نے اسے آگ پر پھینک دیا۔ آگ بھڑک گئی شعلے ادھر ادھر پھیل گئے اور ہیلن چیخنے لگی اور اسے اس کی نرس نے بچالیا۔ آہستہ آہستہ اسے سمجھ آنے لگا تھا کہ چابی کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ ایک دن اس نے اپنی ماں کو کمرے میں بند کر دیا۔ ملازمین کو پہنچنے میں تین گھنٹے لگے پھر انہوں نے آ کر تالا کھولا اور ماں باہر آئی۔ اس کے والدین کو احساس ہوا کہ اس کی تعلیم و تربیت کا صحیح وقت آگیا ہے۔

ہیلن پانچ سال کی تھی کہ اس کے والدین ایک اور گھر میں منتقل ہو گئے۔ ان کا خاندان ماں باپ دو سوتیلے بھائیوں اور بعد میں آنے والی ایک چھوٹی سی بہن پر مشتمل تھا۔ اس کا والد شکار میں بہت دلچسپی رکھتا تھا۔ لیکن اسے اپنے بچوں سے بھی بڑی محبت تھی۔ اور خانہ داری میں بہت دلچسپی لیتا۔ بہر حال اسے اپنے کتوں سے بڑا پیار تھا۔ بڑا مہمان نواز تھا۔ وہ عمدہ کہانیاں سنایا کرتا تھا۔ ہیلن سولہ سال کی تھی جب اس کے والد کا انتقال ہوا۔

ہیلن شروع شروع میں تو اپنی چھوٹی بہن سے حاسد رہنے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ اس نے اس کی اہمیت کم کر دی ہے۔ وہ اسے اپنی ماں کی گود میں بیٹھے ہوئے دیکھ کر پریشان سی ہو جاتی۔ ایک دن اس نے اپنی بہن کا جھولا بھی الٹا دیا اور وہ زمین پر گر پڑی

لیکن بعد میں اسے اس کا احساس ہوا اور آہستہ آہستہ وہ اس سے پیار کرنے لگی۔ پھر ہیلن کو یہ بھی احساس ہونے لگا کہ وہ اپنے خیالات کا صحیح اظہار نہیں کر پاتی۔ جو اشارے اس نے شعوری اور لاشعوری طور پر چن رکھے تھے وہ ناکافی لگنے لگے اور کبھی کبھی اس پریشانی سے تنگ آ کر وہ چیخنے لگتی اسے یوں لگتا کہ کسی نے اس کی زبان تھام رکھی ہے۔ وہ پاگلوں کی طرح چیخنے لگتی لیکن سب لاحاصل ہوتا۔ پریشان ہو کر آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔ وہ پریشان ہو کر اپنی ماں کے بازوؤں میں پناہ لیتی۔ اس کے والدین کو اس ضرورت کا احساس ہونے لگا کہ انہیں کسی سے مدد لینی چاہیے لیکن ان کے قریب کہیں بھی نابیناؤں یا سماعت سے محروم بچوں کا سکول نہیں تھا اور اسے وہاں کوئی پڑھانے بھی نہیں آ سکتا تھا۔ بعض کا تو یہ خیال تھا کہ کوئی استاد اس کی مدد نہیں کر سکے گا۔ کسی نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ کسی ماہر ڈاکٹر سے تعلق قائم کریں۔ ابھی وہ چھ سال کی تھی کہ اس کے والدین اسے بالٹی مور (Baltimore) لے گئے کہ اس کی آنکھوں کا کوئی علاج کرایا جا سکے۔ لیکن ڈاکٹر بیل (Belle) نے معذوری ظاہر کر دی۔ لیکن انہیں پرکنز انسٹی ٹیوشن (Perkins Institution) کا پتہ فراہم کر دیا جو کہ بوسٹن (Boston) میں تھا اور وہاں وہ ڈاکٹر ہاؤ (Howe) سے ملے اور یوں انہیں ایک استاد کا پتہ چل گیا جو ہیلن کی تربیت کے لیے تیار تھی۔ یہ دن ہیلن کے لئے انتہائی اہم تھا۔ جب (Anne Mansfield Sulivan) این مینز فیلڈ سولیون اسے پڑھانے کے لیے پہنچی یہ 3 مارچ 1887ء کا دن تھا اور ہیلن ابھی کوئی سات سال کی ہوئی تھی۔ ہیلن کو یہ معلوم تو نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے لیکن گھر کی ہلچل سے وہ خود جا کر گھر کے دروازے پر کھڑی ہو گئی۔ اس نے آتے ہوئے قدموں کو محسوس کیا اور اپنا ہاتھ پھیلایا۔ کسی نے اس کو پکڑ لیا اور ہیلن کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ اس نے ہیلن کو ایک گڑیا دی اور کہا کہ وہ پرکنز کے ادارہ کے بچوں کی طرف

ہے اس کے لئے تحفہ ہے۔ جب ہیلن اس سے کھیلنے لگی تو مس سولیون نے اسکے ہاتھ پر ڈول (DOLL) کے حروف لکھے۔ ہیلن نے ان حروف کو نقل کرنا شروع کر دیا۔ اور وہ ان کو صحیح لکھنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے یہ حروف اپنی ماں کو بھی لکھ کر دکھائے۔ اسے یہ تو معلوم نہیں تھا کہ وہ حروف لکھ رہی تھی یا یہ کہ یہ حروف تھے۔ وہ تو محض نقل کر رہی تھی اور پھر آہستہ آہستہ اس نے اسی طرح لفظ لکھنے شروع کر دیئے۔ مثلاً Walk, Stand, Sit, Cup, Hat, Pin اور پھر اسے معلوم ہونے لگا کہ اشیاء کے نام ہوتے ہیں۔

ایک دن جب وہ نئی گڑیا سے کھیل رہی تھی تو اس کی معلمہ نے اس کی گود میں پرانی گڑیا بھی رکھ دی اور اس کے ہاتھ پر (DOLL) بھی لکھ دیا اور اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ ان دونوں کھلونوں کا ایک ہی نام ہے اس کی معلمہ نے اس کے ہاتھ پر Mug اور Water اس انداز سے لکھا کہ اسے معلوم ہو جائے کہ یہ دو الگ اشیاء ہیں۔ لیکن ہیلن کو سمجھنے میں بڑی دقت ہوئی جب ایک بار اس کی معلمہ نے اس کے سر پر ہیٹ رکھا تو اسے یہ محسوس ہوا کہ اسے دھوپ میں جانا ہے اور پھر اسے بڑی خوشی ہوئی کہ اسے یہ خیال آنے لگا ہے اور اسے کچھ چیزوں کی شناخت ہونے لگی ہے۔ ایک دن وہ اپنی معلمہ کے ساتھ کہیں جا رہی تھی کہ کچھ پھولوں کی خوشبو آئی اور اسے پھولوں کا احساس ہوا۔ اسی طرح ایک دن کوئی نل سے پانی نکال رہا تھا کہ اس کی معلمہ نے اس کا ہاتھ پانی کے نیچے رکھا۔ جب پانی کی ٹھنڈک اس کے ہاتھ پر سے گزری تو معلمہ نے اس کے دوسرے ہاتھ پر پہلے آہستہ آہستہ Water لکھا اور پھر تیزی سے۔ ہیلن بڑے غور سے محسوس کر رہی تھی کہ کوئی بھولی ہوئی یاد آ رہی ہے۔ پھر اسے محسوس ہونے لگا کہ اس کا نام پانی ہے۔ جو ٹھنڈا ہوتا ہے اور بہتا ہے اسے یقین سا ہو گیا کہ ہر چیز کا نام ہوتا ہے اور ہر نام کے ساتھ ایک خیال

وابستہ ہے۔ جب وہ گھر لوٹی تو اس نے ہر چیز چھونا شروع کر دی اور اسے ہر چیز دھڑکتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ اسے ایک روشنی سی مل گئی تھی اسے گویا یاد آئی جو اس نے کبھی غصے میں توڑ دی تھی۔ اس نے اس کے ٹکڑوں کو اکٹھا کیا اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور پہلی بار اسے پچھتاوے اور افسوس کے احساسات سے دوچار ہونا پڑا۔ پھر اس نے بہت سے لفظ سیکھنا شروع کر دیئے۔ مثلاً Teacher, Sister, Father, Mother وغیرہ۔ یہ دن اس کے لئے بڑی خوشی کا دن تھا۔

اسے 1887ء کے موسم گرما کے بہت سے واقعات یاد آنے لگے اور پھر اس نے چیزوں کو چھو چھو کر دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ جس قدر زیادہ چیزوں کو چھو کر محسوس کرتی اسی قدر اسے خوشی محسوس ہوتی۔ اور جس قدر وہ زیادہ خوشی محسوس کرتی اسی قدر اس کا اعتماد بڑھتا۔ جب پھولوں کا موسم آیا تو مس سولیون اسے کھیتوں میں لے گئی جہاں لوگ زمین کو بیج ڈالنے کے لیے تیار کر رہے تھے۔ اس نے اسے دریا کے قریب گھاس پر بٹھا دیا۔ اسے فطرت کے بارے میں سبق دینے لگی۔ اسے معلوم ہونے لگا تھا کہ کس طرح سورج اور بارش زمین سے ایسی اشیا نکالتے ہیں۔ جو آنکھوں کو بھلی لگتی ہیں۔ اسے معلوم ہونے لگا کہ پرندے کیسے گھونسلے بناتے ہیں۔ کیسے پرندے اور جانور تلاش کرتے ہیں۔ اس کا علم بڑھتا گیا اور اس میں بے پناہ قوت پیدا ہوتی گئی۔ پھر اس نے حساب کے سوال بھی نکالنا شروع کر دیئے۔ معلمہ نے ہیلن کا تعلق فطرت سے بھی قائم کر دیا۔ لیکن اسے یہ بھی محسوس ہونے لگا کہ فطرت ہمیشہ مہربان نہیں ہوتی۔ ایک دن اس کی معلمہ اسے درخت پر چھوڑ گئی کہ اچانک عجیب سی خوشبو محسوس ہونے لگی اور اسے لگا کہ آندھی چلنے والی ہے۔ وہ ڈر گئی اور کانپنے لگی۔ درخت کے پتے ہلنے لگے ہوا اور تیز ہو گئی۔ وہ شاخ کے ساتھ چمٹ گئی کہ اچانک اس کی معلمہ نے اسے پکڑ لیا اور اسے نیچے اتار لیا۔ پھر وہ

بہت دنوں تک درخت پر نہیں چڑھی۔ ایک دن وہ اکیلی اپنے گھر میں تھی اسے لگا کہ عجیب سی خوشبو آ رہی ہے اس نے اپنے ہاتھ پھیلا دیے اور پھر وہ ہاتھ پھولوں کو جا لگے وہ ادھر ادھر چلنے لگی اور پتیوں کو چھونے لگی اور یوں اسے شدت سے پھولوں کا احساس ہو گیا۔ آہستہ آہستہ ہیلن کو یوں لگا کہ اسے زبان کی کلید مل گئی ہے اور اب وہ اسے استعمال کرنے کے لیے بے تاب تھی وہ بچے جو قوت سماعت رکھتے ہیں ان کے ہاتھ تو یہ خزانہ بہت جلد لگ جاتا ہے لیکن بے سماعت بچے کے لیے یہ کتنا مشکل کام ہوتا ہے۔ جس کا اندازہ ہیلن کو تھا لیکن وہ خوش تھی کہ اب اسے زبان مل گئی ہے۔ ہیلن اپنی معلمہ سے بہت کچھ پوچھتی۔ شروع شروع میں تو اسے زیادہ سمجھ نہ آتا لیکن جوں جوں ذخیرہ الفاظ زیادہ ہوتا گیا اسے آسانی ہونے لگی۔ اور تجسس بھی بڑھنے لگا۔ ایک دن اس نے اپنی معلمہ سے "Love" کا مطلب پوچھا۔ مس سولیون نے اسے بوسہ دینا چاہا لیکن وہ اس وقت تک اپنی ماں کے علاوہ کسی سے بوسہ نہیں لیتی تھی پھر مس سولیون نے آہستگی سے اپنے بازو اس کے گرد پھیلا دیئے اور اس کے ہاتھ پر لکھا "I Love Helen" ہیلن میں تم سے پیار کرتی ہوں لیکن ہیلن نے پھر پوچھا محبت ہے کیا؟ معلمہ نے اس کو اپنے بہت قریب اور اس کے دل کی طرف اشارہ کیا اور کہا محبت یہاں ہوتی ہے۔

ہیلن پریشان ہو گئی کیونکہ اس وقت تک وہ صرف وہی باتیں جانتی تھی جنہیں وہ چھو سکتی تھی۔ ہیلن نے اپنی معلمہ کے ہاتھ میں پھولوں کو چھوا اور کچھ بول کر اور کچھ اشاروں سے سوال کیا۔ کیا محبت پھولوں کی خوشبو ہے؟ معلمہ نے نفی میں جواب دیا۔ ہیلن نے سوچا کہ حرارت سے لبریز سورج جو ہم پر چمکتا ہے۔ محبت ہو گا اس نے سورج کی طرف اشارہ کیا۔ کیا یہ محبت ہے؟ ہیلن کے خیال میں سورج سے خوبصورت اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی تھی جس کی حرارت سے ہر چیز میں زندگی آ جاتی ہے۔ لیکن مس سولیون

نے سر ہلا دیا اور ہیلن بہت پریشان ہو گئی۔ وہ سوچنے لگی کہ یہ عجیب بات ہے کہ اس کی معلمہ اسے محبت نہیں دکھا سکتی۔ ایک دو دن گزر گئے ہیلن کچھ موتی (Beads) لئے ہوئے تھی۔ وہ انہیں ایک خاص ترتیب دینا چاہتی تھی۔ وہ ایسا نہیں کر پا رہی تھی حالانہ مس سولیون اسے بار بار سمجھا رہی تھی۔ ہیلن کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور پوری توجہ کے ساتھ وہ انہیں ترتیب دینے لگی۔ معلمہ نے اس کی پیشانی کو چھوا۔ اور اس پر لکھا "Think" (سوچو) پھر ہیلن کو یوں لگا کہ اس کے ذہن میں ایک خیال آیا ہے اور غیر مرئی اشیاء کے حوالے سے اس کے ذہن میں پہلا خیال تھا۔ ہیلن بہت دیر خاموش رہی۔ وہ موتیوں (Beads) کے بارے میں سوچتی رہی اور اس کے ساتھ ساتھ محبت کے معنی بھی تلاش کرتی رہی۔ تمام دن سورج بادلوں کی اوٹ میں رہا۔ کبھی کبھی بارش ہو جاتی اور پھر سورج نمودار ہوتا۔ ہیلن نے اپنی معلمہ سے پوچھا کیا محبت یہی نہیں ہے؟ معلمہ نے جواب دیا تم محبت کو چھو نہیں سکتی جیسے بادلوں کو نہیں چھو سکتی۔ بالکل اسی طرح جس طرح تم بارش کو محسوس کرتی ہو اور یہ اندازہ کر لیتی ہو کہ بارش میں پھول مسکرا اٹھتے ہیں اور زمین میں نئی زندگی جنم لیتی ہے۔ اسی طرح محبت ہوتی ہے۔ تم محسوس کر سکتی ہو کہ محبت کی شیرینی اشیاء میں کس طرح در آتی ہے۔ ہیلن تم محبت کے بغیر خوش نہیں رہ سکتی یوں یہ خوبصورت سچائی ہیلن پر ظاہر ہوئی اور اسے احساس ہوا کہ کچھ چیزیں صرف محسوس کی جا سکتی ہیں۔ شروع شروع میں مس سولیون نے ہیلن سے اسی طرح کا سلوک کیا جیسے ان بچوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ جنہیں سنائی دیتا ہے۔ صرف فرق یہ تھا کہ وہ لفظوں کو بولنے کی بجائے اس کے ہاتھ پر لکھ دیا کرتی۔ کئی سال تک یوں ہی ہوتا رہا۔ معلمہ بہت سے محرکات فراہم کرتی رہی وہ چیزوں کو بار بار لکھتی بار بار دہراتی۔

سماعت اور بینائی سے محروم بچوں کی مشکلات بے پناہ ہوتی ہیں۔ وہ بولنے والے کے

چہرے کے اشاروں کو نہیں سمجھ سکتے۔ انہیں آواز کے زیر و بم کا احساس نہیں ہوتا۔ ہیلن کی زندگی میں دوسرا بڑا قدم یہ تھا کہ اسے پڑھنا سکھایا جائے۔ جونہی ہیلن کچھ لفظوں کے ہجے سیکھ گئی مس سولیون نے اس کے ہاتھ میں کچھ کاغذ کے پرزے دیئے۔ جن میں چھپے ہوئے حروف ابھری ہوئی شکل میں تھے۔ ہیلن کو بہت جلد یہ اندازہ ہو گیا کہ چھپے ہوئے لفظ کن اشیاء کے لیے ہیں۔ کن اعمال کو ظاہر کرتے ہیں اور کن خصوصیات کے حامل ہیں۔ وہ مختلف کاغذ کے پرزوں کو ترتیب سے رکھنا سیکھنے لگی۔ جیسے "Bed", "On", "Is", "Doll" یوں اسے جملے بنانے کا ہنر آنے لگا پھر کاغذ کے پرزوں کی جگہ کتابوں نے لے لی اور اس نے پڑھنا شروع کر دیا اور اسے لفظ پڑھنے میں کچھ ایسا لطف آنے لگا جیسے بچوں کو آنکھ مچولی کھیلنے میں آتا ہے۔ اسے یہ سب کچھ کھیل دکھائی دیتا تھا۔ وہ کہانیاں اور نظمیں بھی پڑھنے لگی۔ مس سولیون اس سے اس طرح باتیں کیا کرتی جیسے وہ خود ایک چھوٹی بچی ہو۔ مس سولیون کو ہیلن سے بے پناہ انس تھا۔ کیونکہ وہ بہت سے نابینا بچوں کے درمیان رہ چکی تھی۔ مس سولیون میں بیان کرنے کی صلاحیت بھی بہت زیادہ تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ سائنس کے خشک موضوعات بھی پڑھانے شروع کئے لیکن کچھ اس دلچسپی کے ساتھ کہ ہیلن کو ان میں بھی بے پناہ لطف محسوس ہونے لگا۔ کبھی کبھی وہ گھر سے باہر چلے جاتے اور وہاں جا کر پڑھتے۔ فطرت کی آغوش میں تدریس کا عمل بہت دلچسپ ہو جاتا۔ وہ اکٹھے سیر کو جاتے پھولوں کو چھوتے اور آہستہ آہستہ ہیلن زندگی کے قریب تر ہوتی گئی۔ اس نے زندگی سے بہت کچھ سیکھا۔ وہ جو کہ محض امکانات کا ایک ڈھیر تھی۔ اپنی معلمہ کی مدد سے آہستہ آہستہ گوشت پوست کا جیتا جاگتا شاہکار بن گئی۔ اس کے ا رد چاہتیں اور خوشیاں پھیل گئیں زندگی معنویت سے لبریز ہو گئی اس کی معلمہ کی ت ذہانت اور کوشش نے اس کی طالب علمی کی زندگی کو دلکش بنا دیا تھا اسے معلوم تھا س

وقت کیا سکھانا ہے۔ ہر استاد بچے کو کمرہ جماعت میں تو لے جا سکتا ہے۔ لیکن اسے سیکھنے پر مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ جب تک یہ سب کچھ انتہائی محبت اور چاہت سے نہ کرے۔ ہیلن کی خوش بختی تھی کہ اسے مس سولیون جیسی معلمہ دستیاب ہو گئی۔ جس نے اسے آہستہ آہستہ کتابوں سے اشیاء سے اور زندگی سے متعارف کرایا۔ ہیلن ایک کرسمس کا واقعہ بیان کرتی ہے۔ اور بتاتی ہے کہ کس طرح اسے کرسمس کے دن تحائف کا انتظار تھا۔ کس طرح وہ کرسمس کے درخت کے قریب رقص کرتی تھی۔ اس کی معلمہ نے اسے تحفے میں ایک پرندہ دیا۔ جس کو اس نے ایک پنجرے میں رکھ دیا اور پھر ہیلن بڑی محبت سے اس کی دیکھ بھال کرتی رہی اور یوں اسے ایک زندہ چیز کی دیکھ بھال کا سلیقہ آ گیا۔ مئی 1888 میں ہیلن بوسٹن گئی اور وہاں پر کنز انسٹی ٹیوشن فار دی بلائنڈ میں داخلہ لے لیا۔ اس کی معلمہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ پہلی بار اس کی ملاقات بہت سے بے بصر بچوں سے ہوئی۔ جو ہاتھ سے چھو کر پڑھتے تھے۔ ہیلن کو بڑی خوشی ہوئی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ دیکھ نہیں سکتی لیکن اب اسے معلوم ہوا کہ اور بہت سے بچے بھی بینائی سے محروم تھے لیکن اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ جب نابینا بچے اس سے لپٹنے لگے۔ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیئے ہاں وہ سن ضرور سکتے تھے۔ سب بہت خوش تھے بہت ہی مطمئن۔ ہیلن بھی اپنا سارا دکھ بھول گئی۔ ایک ہی دن میں وہ سب سے مانوس ہو گئی اور دن تیزی سے گزرنے لگے۔ اسے وہ ادارہ ہی دنیا معلوم ہونے لگا۔ وہ بچوں کے ساتھ بہت سے مقامات پر تفریح کے لیے جایا کرتی اور زندگی کا لطف اٹھاتی جب ادارہ گرما کی تعطیلات کے لیے بند ہوا تو ہیلن اور مس سولیون چھٹیاں گزارنے کے لیے مختلف مقامات کی سیر کو گئیں۔ ہیلن سمندر کے کنارے بھی گئی اور ساحل سے سمندر کے ماحول کو محسوس کیا اور ہر چیز کو بہت قریب سے دیکھا تجربات ہی تجربات اس کی زندگی کا حصہ بنتے جا رہے تھے۔ موسم خزاں میں وہ

اپنے گھر گئی اور پھر بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ ملاقاتیں اس کی زندگی میں نئے رنگ بھرتی تھیں۔ اسے سیر و سیاحت سے عشق سا ہو گیا تھا۔ وہ ایک جگہ سکون سے رہ ہی نہیں سکتی تھی۔

1890ء کی بہار کا ایک پُر بہار دن تھا جب اس کی زندگی میں بھی بہار آئی اور اس نے بولنا سیکھ لیا۔ وہ پہلے بھی بولنے کی کوشش کیا کرتی تھی شور مچایا کرتی تھی۔ کبھی اپنا ہاتھ گلے پر رکھ لیتی تھی اور دوسرے ہاتھ سے اپنے ہونٹوں کو محسوس کیا کرتی تھی جب کوئی شور ہوتا تو اسے خوشی ہوتی۔ وہ گانے والوں کے گلے پر ہاتھ رکھا کرتی یا جب پیانو بجتا تو اسے چھو لیا کرتی تھی۔ اپنی بینائی اور سماعت ضائع ہونے سے پہلے وہ بہت تیزی سے بولنا سیکھ رہی تھی لیکن بیماری کے حادثے کے بعد وہ بول نہ سکتی تھی کیونکہ اسے سنائی نہیں دیتا تھا وہ اس زمانے میں اپنی ماں کی گود میں بیٹھی رہتی اور اپنے ہاتھ اس کے چہرے پر رکھ دیتی۔ کیونکہ اسے ہونٹوں کی حرکت بہت اچھی لگتی اور پھر وہ اپنے ہونٹ بھی ہلایا کرتی اگرچہ اسے بات کرنا بھول گیا تھا لیکن اس کے دوست بعد میں اسے بتاتے تھے وہ ہنسا کرتی تھی اور چیخا بھی کرتی تھی اور کچھ آوازیں بھی نکالا کرتی تھی وہ لفظ Water بولنا سیکھ گئی تھی لیکن بعد میں وہ اسے بھی بھول گئی تھی۔ اسے بہت دیر کے بعد معلوم ہوا تھا کہ اس کے ارد گرد کے لوگ مختلف طریقوں سے باتیں کرتے ہیں ابھی اسے یہ معلوم نہیں ہوا تھا کہ بہرے بچے بھی بولنا سیکھ سکتے ہیں۔ اسے اکتاہٹ سی محسوس ہوا کرتی تھی کیونکہ وہ بھی کچھ کہنا چاہتی تھی۔ یہ احساس آہستہ آہستہ شدید ہونے لگا تھا اور اس سے پہلے ایک بہرے سماعت نابینا بچی بولنا سیکھ گئی تھی اس کی خواہش میں ایک اور اضافہ ہو گیا تھا پھر آہستہ آہستہ اس نے بولنا سیکھا اس نے گفتگو کے بنیادی عناصر سیکھ لئے تھے ایک معلمہ مس Fuller نے اسے بولنا سکھایا پھر مس سولیون اس کی باتیں سمجھنے لگی تھیں لیکن کسی اور کو اس کی باتیں سمجھ نہیں آتی

تھیں مس سولیون نے انتہائی محنت اور جانفشانی کے ساتھ ہیلن کی مدد کی اور ہیلن نے بھی شبانہ روز کوششیں جاری رکھیں اور اپنی آواز کو قابل تفہیم بنانے کی کوشش کی۔ لفظوں کے صحیح تلفظ ادا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی وہ اپنی معلمہ کے ہونٹوں کو چھو کر اس کی باتوں کا اندازہ لگا سکتی تھی۔ وہ چھو کر گلے کی تھرتھراہٹ سے بھی بہت کچھ جان لیا کرتی تھی۔ منہ کی حرکت سے اور چہرے سے بھی اسے اندازہ ہو جایا کرتا تھا لیکن کبھی کبھی اس سے غلطی بھی ہو جایا کرتی۔ وہ لفظوں اور جملوں کو بار بار دہراتی۔ کبھی حوصلہ نہ ہارتی اسے امید تھی کہ وہ مکمل طور پر بولنا سیکھ جائے گی اور اس کی چھوٹی بہن بھی اس کی باتیں سمجھنے لگے گی وہ بار بار کہا کرتی کہ وہ اب بے سماعت نہیں ہے کیونکہ وہ اپنی ماں سے باتیں کر لیتی ہے اور اس کے ہونٹوں سے جوابات بھی حاصل کر لیتی ہے لیکن پھر بھی وہ بلکہ گفتگو کیا کرتی تھی جو ہونٹوں کی مدد سے گفتگو سے نسبتاً آسان طریقہ تھا۔ وہ لوگوں کے ہاتھوں پر تحریر کرتی اور لوگ اس کے ہاتھ پر انگلیوں سے حرف بناتے اور اسے یہ طریقہ بہت سہل محسوس ہونے لگا تھا۔ استعمال سے انگلیاں مختلف حرکات کی عادی ہو جاتی ہیں۔ لیکن کچھ لوگ بہت تیزی سے لکھا کرتے تھے جیسے کوئی ٹائپ رائٹر سے لکھ رہا ہو۔ جب وہ بولنے لگی تو اسے بہت خوشی ہوئی۔ اور بہت باتیں کرنے لگی صرف باتیں کرنے کے لیے وہ Tuscumbia جہاں اس کا گھر تھا پہنچی تھی اپنے تمام اہل خانہ سے ملی اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے اس کی ماں نے اسے سینے سے لگایا اور وہ ان سے باتیں کرنے لگی۔

اسی دوران ایک عجیب و غریب واقع ہوا۔ 1892ء میں ہیلن نے ایک کہانی لکھنا شروع کی جو اس کے گھر والوں نے بہت پسند کی اور ہر طرف اس کی دھوم مچ گئی اور ایسا لگا کہ ہیلن کہانی کار ہونے والی ہے۔ اس کہانی کا نام "The Frost King" تجویز ہوا

لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ اس قسم کی کہانی ہیلن نے سنی تھی اور لاشعوری طور پر اس نے اس کو کم و بیش اسی شکل میں تحریر کر دیا۔ جب یہ حقیقت معلوم ہوئی تو ہیلن بہت شرمندہ ہوئی اور اس نے زندگی میں کہانیاں لکھنے کا ارادہ ہی ترک کر دیا۔ وہ خط لکھتے وقت بھی اس خوف میں گرفتار رہتی کہ کہیں وہ کسی اور کے جملے تو نہیں لکھ رہی۔ آہستہ آہستہ اسے یہ واقعہ بھول گیا اور اس نے اپنی زندگی کے بارے میں کچھ لکھنے کا ارادہ کیا لیکن پھر بھی لاشعوری طور پر اسے یوں لگتا رہا کہ کہیں وہ کسی حوالے سے سرقہ کی غلطی تو نہیں کر رہی۔ یہ خوف بری طرح اس کا پیچھا کرتا رہا لیکن مس سولیون اس کی ڈھارس بندھاتی رہی۔ اس کی عمر بارہ سال ہو چکی تھی۔ اس نے کچھ نہ کچھ لکھنا شروع کیا اور اس میں ذہنی بالیدگی بھی پیدا ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کا سفر جاری رہا۔ 1893ء میں وہ واشنگٹن گئی اس نے ساحلوں کی سیر کی لوگ پوچھتے "حسن اور موسیقی کا تمہارے ذہن میں کیا تصور ابھرتا ہے تم موجوں کو ساحل سے ٹکراتے ہوئے نہ دیکھ سکتی ہو نہ سن سکتی ہو تمہارے نزدیک ان کی کیا اہمیت ہے" لیکن ہیلن یہ تمام چیزیں محسوس کر سکتی تھی۔ ہیلن اور مس سولیون نے بہت سے تفریحی مقامات کی سیر کی جن میں نیاگرا (Niagara) کی آبشاریں بھی شامل تھیں۔ ہیلن اپنی کمال قوت احساس سے اشیاء کا ادراک کر سکتی تھی اور بھرپور انداز سے لطف اندوز ہو سکتی تھی وہ کبھی کشتی میں بیٹھتی تو کبھی کسی جہاز میں کبھی کسی سرائے میں کبھی کسی میلے میں کبھی کسی باغ میں تو کبھی بازار میں وہ زندگی کا تمام حسن اور موسیقی اپنی حسیت سے اپنی شخصیت میں شامل کرنا چاہتی تھی۔ کبھی چھو کر کبھی پڑھ کر اور کبھی جان کر اسے انسانیت سے بلا کی دلچسپی ہو گئی تھی کوئی اسے انتہائی لطیف اور نازک اشیاء بھی چھونے سے منع نہیں کرتا تھا اس کا تجسس اور انہماک زندگی سے محبت جوش و خروش ہر ایک کے لئے انتہائی دلچسپی کا باعث تھا وہ عالمی میلے میں

بھی گئی اور ہر چیز کو انگلیوں سے چھو کر دیکھا اور اسے ہر شے انتہائی دلچسپ لگی۔ دنیا کے ہر کونے سے آئی ہوئی مصنوعات فنون لطیفہ کے نمونے اس کی توجہ کا باعث بنے اسے ان میں زندگی دھڑکتی ہوئی دکھائی دی۔ کبھی ان میں اس کو خدا کا عکس دکھائی دیتا۔ اس نے جواہرات کی کانیں بھی دیکھیں جو مشین موجود ہوتی وہ مکمل طور پر اسے چھوتی حرکت کرتے ہوئے اور مختلف کام سرانجام دیتے ہوئے ڈاکٹر بیل جیسے افراد بھی اس کے ساتھ ساتھ ہو لئے۔ اس نے ٹیلیفون کے طریق کار کا بھی مشاہدہ کیا اور مختلف ایجادات کو بہت قریب سے دیکھا۔ علم بشریت سے متعلق شعبے میں گئی اور قدیم یادگاریں اس کی توجہ کا باعث بنیں اس نے پتھر کے زمانے کی چیزیں محسوس کیں۔ ہر چیز اسے زندگی کا حصہ محسوس ہوتی تھی اور وہ اس میں بھرپور حصہ لیتی تھی۔

قدیم اشیاء کے بارے میں اس نے ایک خوبصورت بات کہی ہے۔ "The simple monuments of nature's un-lettered children" فطرت کے ناخواندہ بچوں کی سادہ یادگاریں۔ وہ انہیں چھو کر دیکھتی اور لطف اٹھاتی اس نے مصر ممیاں بھی دیکھیں جنہیں دیکھ کر اسے ڈر لگا۔ چنانچہ یہ نمائش اس کے لئے بڑی یادگار رہی۔۔۔ اور یہ عالمی میلہ اس کے لئے بڑی دلچسپی کا باعث رہا۔ سیر و سیاحت کے ساتھ اس کی کتابوں کے لئے دلچسپی کبھی کم نہیں ہوئی۔ اس نے یونان، روم اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کی تواریخ کا مطالعہ کیا وہ فرانسیسی گرامر بھی جانتی تھی اور اسے فرانسیسی زبان سے بھی واقفیت تھی۔ وہ فرانسیسی تلفظ بھی ادا کرنے کی کوشش کرتی یہ سب کچھ وہ کتابوں کی مدد سے کیا کرتی اس طرح اس نے فرانسیسی زبان کا بڑا علم حاصل کر لیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی بولنے کی صلاحیت کو بھی بڑھانے کی ہر ممکن کوشش کرتی رہی کبھی کبھی وہ مس سولیون کو بلند آواز سے پڑھ کر سناتی اور اپنے پسندیدہ شعراء کی نظمیں پڑھتی جو اسے یاد ہو

گئی تھیں مس سولیون اس کا تلفظ درست کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی اس نے پڑھنے لکھنے کے مخصوص اوقات مقرر کر رکھے تھے۔ اس نے مسٹر Irons جو کہ ان کا پڑوسی تھا سے لاطینی سیکھنا بھی شروع کر دی اور لاطینی گرامر سیکھی۔ شروع شروع میں اسے لاطینی گرامر میں دلچسپی پیدا نہیں ہوئی لیکن پھر بھی وہ پڑھتی رہی۔ 1894ء میں ایک امریکی انجمن کے اجلاس میں شریک ہوئی جس میں بے سماعت بچوں کو گفتگو کرنا سکھانے کے بارے میں غور و فکر ہو رہا تھا۔ ہیلن بہروں کے لئے ایک سکول میں گئی۔ مس سولیون اس کے ساتھ تھی۔ یہاں ہیلن کو گفتگو کے حوالے سے بہت کچھ معلوم ہوا۔ وہ یہاں دو مہینے ٹھہری۔ یہاں اس نے ریاضی، طبعیات، جغرافیہ اور فرانسیسی اور جرمن زبانیں بھی پڑھیں۔ مس ریمی (Reamy) کے ساتھ جو جرمن زبان کی معلمہ تھی جرمن بھی بولنے لگی۔ اس نے جرمن زبان میں خاصی ترقی کر لی لیکن اسے فرانسیسی نسبتاً مشکل لگی۔ وہ اپنی فرانسیسی معلمہ کی لب خوانی صحیح طرح نہیں کر سکی اس لئے اسے دقت ہوئی اسے لب خوانی اور فن گفتگو میں توقعات کے مطابق مہارت حاصل نہ ہو سکی وہ چاہتی تھی کہ دوسروں کی طرح گفتگو کر سکے لیکن اس کے اساتذہ اب بھی پر امید تھے۔ ریاضی میں بھی اسے کچھ دقتیں ہوئیں لیکن اس نے اپنی دلچسپی اور محنت جاری رکھی اسکے یہ دو سال انتہائی دلچسپی سے گزرے۔ وہ وہاں سیر بھی کیا کرتی تھی۔ فطرت سے لطف اندوز بھی ہوتی تھی اور اپنی پڑھائی میں بھی پوری دلچسپی لیتی تھی۔ اساتذہ نے ہر معاملے میں اس کی پوری مدد کی۔

اکتوبر 1896ء میں وہ خواتین کے لئے کیمبرج سکول میں داخل ہوئی۔ یہاں سے اسے کالج میں داخلے کے لیے تیار ہونا تھا۔ اسے کالج جانے اور ہاورڈ میں داخلہ لینے کا بڑا شوق تھا تاکہ وہ بینا اور باسماعت طلبا اور طالبات کے ساتھ مقابلہ کرے۔ کیمبرج سکول میں بھی اسے بڑی کامیابی ہوئی۔ اگرچہ اساتذہ صرف عام بچوں کو پڑھانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ہیلن

ان سے صرف لب خوانی کے ذریعے گفتگو کر سکتی تھی۔ وہاں اس نے انگریزی تاریخ انگریزی ادب، جرمن، لاطینی، ریاضی وغیرہ کا مطالعہ کیا۔ اسے جرمن سے بڑی دلچسپی ہو گئی اور اس نے دوسری زبانیں بھی سیکھ لیں۔ گو تمام کتابیں بریل میں موجود نہیں تھیں چنانچہ اسے بہت کچھ سننا پڑا۔ اگرچہ گفتگو میں اسے اب بھی دقت ہوتی تھی لیکن اساتذہ اس بات کو کبھی خاطر میں نہ لاتی تھیں۔ وہ کلاس میں Notes بھی نہیں لے سکتی تھی گھر جا کر وہ ساری کمی کو پورا کر لیتی۔ مس سولیون کلاسز میں ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتی اور بہت سی چیزیں اس کے ہاتھ پر لکھتی رہتی۔ جو کچھ بریل میں نہیں ہوتا تھا وہ اسے لکھوایا کرتی یا بار بار سنایا کرتی۔ وہاں اس نے Schiller کا مطالعہ بھی کیا اور بہت سی جرمن ادیبوں اور شعراء کا مطالعہ کیا۔ Goethe کو بھی اپنے مطالعے میں شامل کیا اسے Schiller کی نظمیں بہت اچھی لگتیں۔

"As you like it" کا مطالعہ کیا Macaulay کو پڑھا۔ Burke اور جانسن کی تقاریر کا مطالعہ کیا۔ پہلی بار بینا اور باسماعت لڑکیوں کے ساتھ اسے دوستی کا مزہ آیا اور بہت اچھے لمحات گزارے۔ ان کے ساتھ بہت سی کھیلوں میں شرکت کی۔ کچھ لڑکیوں نے اس کے ساتھ گفتگو کرنا بھی سیکھ لیا۔ پھر اس نے اپنے ابتدائی امتحانات اعزاز سے پاس کئے تاکہ وہ کالج میں داخلہ لے سکے۔ اس نے جرمن، فرانسیسی، لاطینی، انگریزی، یونانی اور رومن تاریخ میں امتحانات پاس کئے۔ امتحان میں اس نے ٹائپ رائٹر استعمال کی جس سے اس کی شناخت تو چھپائی نہیں جا سکی جو کہ طریقہ امتحان میں ضروری تھی۔ اسے ٹائپ کرنے کے لئے ایک علیحدہ کمرہ دیا جاتا تاکہ اس کی ٹائپ رائٹر کا شور دوسروں کے لئے مشکل کا باعث نہ بنے۔ کوئی شخص اسے پرچے پڑھ کر سناتا اور دروازے پر ایک شخص نگرانی کے لئے کھڑا رہتا۔ کوئی اسے پرچہ بتاتا وہ اسے دہراتی تاکہ اسے یقین ہو سکے کہ وہ صحیح سن رہی

ہے۔ تمام پرچوں میں اس نے کامیابی حاصل کی اب امید اور جوش و خروش کی شمع کی لو کچھ اور تیز ہو گئی۔ پھر اس نے رگل مین سکول میں اپنا دوسرا سال شروع کیا۔ اسے بالخصوص ریاضی پر زیادہ توجہ دینا تھی اور طبیعات، الجبرا، جیومیٹری، علم نجوم Astronomy یونانی اور لاطینی جیسے مضامین پڑھنے تھے۔ ابھرتی ہوئی کتابیں دستیاب نہیں تھیں اور اسے ہدایات لکھنے میں دقت ہوتی تھی۔ مس سولیون اسے کتابیں پڑھ کر سنایا کرتی۔ بہر حال لکھنا بہت ضروری ہو گیا تھا۔ اسے الجبرا اور جیومیٹری بھی کلاس ہی میں حل کرنا پڑتے۔ چنانچہ اس نے بریل رائٹر کا استعمال کیا وہ جیومیٹری کی اشکال تو نہیں دیکھ سکتی تھی جو بلیک بورڈ پر لکھی ہوتی تھیں یہ اشکال کشن پر سیدھی اور آڑی لکیروں کے ذریعے اسے سمجھائی جاتیں۔ کبھی کبھی وہ حوصلہ بھی ہار جاتی۔ لیکن اس کی معلمہ اس کی ڈھارس بندھاتی رہتی۔ آہستہ آہستہ مشکلات کم ہونا شروع ہو گئیں۔ ابھری ہوئی کتابیں اور پڑھنے لکھنے کی دوسری اشیاء اسے دستیاب ہونے لگیں۔ اور اس کا جوش و خروش بڑھ گیا۔ الجبرا اور جیومیٹری پھر بھی قدرے مشکل رہے۔ اسے ریاضی سے کوئی خاص رغبت نہیں تھی۔ اس میں بھی دقتیں ظاہر ہوتی رہیں۔ جیومیٹری کے ڈایا گرامز بھی اسے خاصے مشکل لگتے تھے۔ اساتذہ کا خیال تھا کہ اسے کالج میں داخل ہونے سے پہلے تیاری کے لئے چار پانچ سال درکار ہوں گے لیکن ہیلن بالکل اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ کالج میں داخل ہونا چاہتی تھی چنانچہ اس کے لئے ایک پرائیویٹ ٹیوٹر کا انتظام کیا گیا جس کا نام Keith تھا۔ اس نے ہیلن کو الجبرا، جیومیٹری، یونانی اور لاطینی کے مضامین میں خاصی مدد دی۔ یوں کمرہ جماعت سے باہر رہ کر اس نے زیادہ دلچسپی سے اپنی تیاریاں شروع کر دیں۔ مسٹر Keith نے مضامین کو خاصا دلچسپ بنا دیا۔ اور بہت سے مسائل حل ہونے لگے۔

29-30 جون 1900ء کو اس کے امتحانات ہوئے تا کہ وہ ریڈ کلف

(Redcliffe) کالج میں داخل ہو سکے۔ اس بار اسے پرچے بھی بریل میں مہیا کیے گئے تا
کہ وہ خود پڑھے اور ٹائپ کرے۔ یہ طریقہ زبانوں کے سلسلے میں تو کامیاب رہا لیکن جب
جیومیٹری اور الجبرا کی باری آئی تو مشکلات رہیں۔ اس سے بہت سے نشانات اور علامات
سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ بہت سی دقتوں کے بعد یہ مرحلہ طے ہو گیا۔ اور کالج میں داخل
ہونے کی یہ طویل آزمائش اختتام کو پہنچی۔ کالج میں داخل ہونے سے پہلے یہ فیصلہ کیا گیا
کہ اسے ایک سال اور مسٹر Keith سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے۔ چنانچہ 1900 ء میں
اس کا کالج میں داخل ہونے کا خواب شرمندہ تعبیر ہوا۔ ہیلن کو Redcliffe کالج میں
داخل ہو کر بہت لطف آیا۔ وہ سالہا سال سے اس دن کا انتظار کرتی رہی تھی اسے بینا اور
باسماعت لوگوں کے ساتھ ساتھ حصول تعلیم میں جدوجہد سے بے پناہ لطف آنے لگا۔ اور
اس کے سامنے نئی راہیں کھلنے لگیں۔ جہاں امکانات ہی امکانات تھے اور ہیلن کے لیے
یہ ایک بہت بڑا تجربہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ پروفیسر دانائی کا سرچشمہ ہوتے ہیں۔ اور اس
طرح اس کی رسائی علوم کی گہرائی تک ہو جائے گی۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ
اسے معلوم ہوا کہ کالج میں وہ سب کچھ نہیں تھا جس کا خواب وہ دیکھا کرتی تھی۔ اب اس کے
پاس سوچنے کے لیے وقت باقی نہیں رہا تھا ایک دوڑ دھوپ ہر طرف جاری تھی اب
اس کے پاس وہ فرصت نہیں تھی کہ وہ دل کی موسیقی اور ذہن کے نغموں کو سن سکتی۔
اسے معلوم ہوا کہ کالج میں سیکھنے جاتے ہیں۔ سوچنے نہیں جاتے کالج کے پہلے سال میں
اسے فرانسیسی، تاریخ، جرمن، انگریزی ادب وغیرہ پڑھنا تھے۔ فرانسیسی میں اس نے کارنیل
(Cornoille) Moliere Racine وغیرہ کو پڑھا اور جرمن میں گوئٹے اور
Schiller کو اس نے انگریزی ادب کا بھی خوب مطالعہ کیا۔

جہاں تک کمرہ جماعت میں مصروفیات کا تعلق ہے۔ وہ عملی طور پر تنہا ہوتی تھی اور

اسے یوں لگتا تھا کہ جیسے پروفیسر ٹیلیفون کے ذریعے بول رہا ہو۔ لیکچرز کو جلدی جلدی اس کے ہاتھوں پر لکھ دیا جاتا۔ لیکن اسے لیکچر کا مزہ نہیں آتا تھا۔ لفظ دوڑتے بھاگتے محسوس ہوتے تھے۔ لیکن وہ لڑکیاں جو Notes لیتی تھیں وہ ان سے کسی طرح پیچھے نہیں رہتی تھی۔ وہ لیکچر کے دوران خود Notes نہیں بنا سکتی تھی۔ کیونکہ اس کے ہاتھ مصروف ہوتے تھے۔ ان پر کچھ لکھا جا رہا ہوتا تھا۔ لیکن وہ گھر جا کر جو کچھ اسے یاد رہتا لکھ لیتی۔ وہ تمام مشقیں وغیرہ گھر جا کر کرتی وہ امتحانات ٹائپ رائٹر کے ذریعے دیتی۔ وہ Hammond ٹائپ رائٹر استعمال کرتی کیونکہ اس کے نزدیک یہ سب سے بہتر تھی۔ بریل میں بہت کم کتب دستیاب تھیں۔ اس لئے اس کی دشواریاں بہت زیادہ تھیں۔ کبھی کبھی وہ پریشان بھی ہو جاتی اسے اپنی منزل بہت دور دکھائی دیتی لیکن پھر وہ مسکرا دیتی اور سوچتی کہ وہ جہد حیات میں تنہا تو نہ ہوگی۔ اگلی کلاسوں میں بھی کم بیش اس نے یہی مضامین پڑھے اور کلاس کی اساتذہ کا خوب مطالعہ کیا۔ ادب کو انتہائی دلچسپی سے اپنے مطالعے میں شامل رکھا وہ کالج کے اساتذہ سے بہت مطمئن نہیں تھی۔ ان میں وہ بات نہیں تھی جو یونانی حکماء میں تھی وہ گھٹے گھٹے سے رہتے تھے لیکن بعض اچھے پروفیسر بھی تھے جو چیزوں کی وضاحت کرتے تھے لیکن ہیلن سوچتی تھی ایک دن میں بہت سے مضامین پڑھنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ ہر ایک مضمون میں اپنی دنیا ہوتی ہے۔ مختلف نظریات ہوتے ہیں۔ پھر سب کو ذہن میں ہم آہنگ رکھنا کتنا مشکل ہے۔ ذہن میں یہ سب کچھ ترتیب سے رکھنا اسے بہت مشکل محسوس ہوتا کیونکہ اس کا ذہن بنیادی طور پر گہرائی کو پسند کرتا۔ اسے وسعتوں سے اتنی محبت نہیں تھی تاآنکہ ان سے انصاف ہو سکے۔ اسے امتحانوں کے تصور سے بڑی الجھن ہوتی اور وہ اس کے ذہن میں ہلچل پیدا کر دیتے۔ کالج کے دن گو اس کے خوابوں کے تعبیر نہیں تھے

لیکن اس نے وہاں صبر و تحمل سیکھا اور زندگی کے کئی نئے پہلو اس کے سامنے واضح ہوئے۔

ہیلن نے اپنی زندگی کا بہت حصّہ کتابیں پڑھنے میں گزارا اور ان سے دانائی حاصل کی۔ وہ دانائی جو باقی لوگ بینائی اور سماعت سے حاصل کرتے ہیں۔ اسی لئے کتابیں اس کی زندگی میں بہت اہم تھیں۔ سات سال کی عمر سے لے کر زندگی کے اختتام تک اس کا تعلق کتابوں سے نہیں ٹوٹا۔ گو بریل میں کتابیں بہت کم دستیاب تھیں۔ لیکن جو تھیں اس نے انہیں بار بار پڑھا۔ سکول کی لائبریری میں جو کتابیں اسے ملیں اس نے ایک ایک سطر بڑے انہماک سے پڑھی۔ ذخیرہ الفاظ بڑھتا چلا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ باتیں کرنے لگی تو ہر کوئی کہا کرتا کہ اسے کتنے الفاظ یاد ہیں۔ وہ لائبریری کے ایک کونے میں بیٹھ جایا کرتی اور پڑھتی چلی جایا کرتی۔ اسے وقت کا بھی احساس نہیں رہتا تھا۔ کچھ کتابیں خصوصاً بریل میں اس کے لئے تیار کی گئیں۔ یونانی ادب کے مطالعے نے اس کے ذہن پر بہت دل خوش کن اثر مرتب کیا۔ اسے یوں لگتا کہ یونانی دیویاں اور دیوتا زمین پر چلتے ہوئے اور باتیں کرتے ہوئے موجود تھے اور کبھی کبھی وہ اس کے دل کے مندر میں آ بستے ایلیڈ کو پڑھ کر یونان اس کے خیالوں کی جنت بن گیا۔ بڑی شاعری خواہ وہ اہل یونان نے تخلیق کی یا انگریزی میں لکھی گئی پڑھنے کے لئے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بس دل میں قبولیت کی قوت ہونی چاہیے۔ اس لئے ہیلن شاعری سے بہت متاثر ہوئی۔ اس کا دل شعراء کی دنیا میں کھو سا جاتا۔ اس نے بائبل کا مطالعہ اس وقت سے شروع کر دیا تھا۔ جب وہ اسے سمجھ بھی نہیں سکتی تھی۔ لیکن پھر وہ اس کی موسیقیت میں کھو گئی۔ بعد میں اسے یہ کتاب سب سے اچھی لگنے لگی۔ اسے بائبل کی بہت سی کہانیاں بہت دلکش محسوس ہونے لگیں۔ جن میں اس نے بالخصوص Ruth روتھ کا ذکر کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ

بائبل پڑھ کر مجھے کچھ یوں لگتا ہے کہ دیکھی ہوئی چیزوں سے ان دیکھی چیزیں زیادہ دائمی ہیں اس نے Charleslamb کی Tales from Shakespeare بچپن ہی میں پڑھ لی تھیں وہ شیکسپیئر کے ڈرامے Macbeth سے بہت متاثر تھی اس ڈرامے میں بھوت اور چڑیلوں کا خیال اس کے خوابوں میں بھی موجود رہا۔ Kinglear میں اسے گلوسیسٹر (Gloucester) کی آنکھیں نکالنے والا سین بہت ہیبت ناک لگا اور اس کی انگلیاں ٹھہر سی گئیں۔ وہ آگے نہ پڑھ سکی۔

Shylock اور Paradise Lost میں شیطان کا کردار اسے برا نہیں لگتا تھا۔ شائیلاک کو اس کے خیال میں کسی نے صحیح ہونے ہی نہیں دیا۔ وہ Wordsworth کی بھی شیدائی تھی جس میں فطرت اور انسان کی وحدت موجود تھی۔ ادب اس کے لئے بعض اوقات خیالستان کا کام کرتا۔ یہ ادیب اور شاعر اس کے دوست اس کے ساتھی اور اس کے ہمراز تھے۔

کتابوں کے علاوہ اسے سیر و سیاحت کا بہت شوق تھا۔ اور وہ چل پھر کر فطرت سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھی۔ وہ کشتی رانی بھی کرتی اور تیراکی بھی۔ کشتی میں اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی ہوتا اور وہ کشتی چلاتی۔ درختوں سے اسے بے پناہ محبت تھی۔ وہ ہریالی پر جان دیتی تھی۔ محسوس کر کے ایک عجیب مزا اٹھاتی تھی۔ اسے کتوں سے بھی پیار تھا اور اس کے پاس کئی کتے تھے جو اس کے ساتھ چلا کرتے تھے۔ وہ انہیں اپنا دوست سمجھتی وہ بعض کھیلیں بھی کھیلتی تھی اور ان میں بے پناہ لطف لیتی تھی اور کبھی کبھی سوچتی تھی کہ ہاتھ آنکھ سے زیادہ چیزوں کو دیکھ سکتا ہے۔ اور اشیاء سے متعارف کرا سکتا ہے وہ ایکٹروں سے بھی ملتی تھی۔ اس طرح اس نے زندگی سے بھرپور لطف اٹھایا اور اس کے ہر گوشے کو قریب سے محسوس کرنے کی کوشش کی۔ اپنی سوانح عمری کے آخر میں اس نے جن

خوبصورت جذبات کا اظہار کیا ہے۔ اپنی سوانح عمری جو اس نے 1902 میں تحریر کی جس سے اس مضمون کی تحریر میں خاصی مدد ملی ہے کے آخر میں وہ لکھتی ہے کیا یہ بات سچ نہیں کہ میری تمام مجبوریوں کے باوجود میں نے بعض جگہ زندگی کی خوبصورتیوں کو محسوس کیا ہے۔ ہر چیز میں حیرتیں پنہاں ہیں۔ یہاں تک کہ تاریکی اور خاموشی میں بھی جس حالت میں بھی ہوں۔ سیکھنے کی کوشش کرتی ہوں ۔ قانع ہوں۔ بعض اوقات اس میں شک نہیں کہ مجھے تنہائی کا احساس سرد کہر کی طرح لپیٹ لیتا ہے۔ جب میں اکیلی ہوتی ہوں اور زندگی کے بند دروازے پر انتظار کر رہی ہوتی ہوں دروازے کے اس پار روشنی ہے۔ موسیقی ہے اور شیریں محفلیں ہیں۔ میں ان میں شامل نہیں ہو سکتی۔ تقدیر خاموش اور بے رحم ہے۔ جس نے یہ دروازہ مجھ پر بند کر دیا ہے۔ کبھی کبھی میں اس کی مرضی پر اعتراض کرتی ہوں کیونکہ میرا دل اب بھی ہار نہیں مانا اور اس میں جذبات ہیں۔ لیکن میری زبان پر کبھی تلخ اور بے کار لفظ نہیں آئیں گے بلکہ وہ ان آنسوؤں کی طرح جو بہہ نہیں سکتے واپس دل میں جا کر ٹھہر جائیں گے۔ میری روح پر خاموشی طاری ہے۔ لیکن پھر امید مسکراتے ہوئے میرے کانوں میں کہتی ہے۔ "اپنے آپ کو بھول جانے میں بڑا لطف ہے" "چنانچہ میں دوسروں کی آنکھوں میں اپنی روشنی کا سورج تلاش کرتی ہوں اور دوسروں کے کانوں میں اپنی موسیقی اور دوسروں کے ہونٹوں پر اپنی خوشی"

ہیلن کیلر کے یہ الفاظ اس کی روح کا وہ نغمہ ہیں جو محبت کی دنیا میں اب بھی اپنی روشنی بکھیر رہا ہے۔ ہیلن کی ہمت تگ و تاز زندگی سے محبت ایسے اوصاف ہیں جنہوں نے نہ صرف ہیلن کو ایک Legend بنا دیا بلکہ ہر قاری کی زندگی میں انقلاب پیدا کر سکتے ہیں۔ ہم ہمہ وقت فطرت کی شاکی رہتے ہیں۔ کبھی خدا سے گلہ ہوتا ہے۔ کبھی دوستوں سے کبھی قسمت سے کبھی اپنی ذات سے لیکن ہیلن کو دیکھیے دیکھتے چلے جائیے تمام

شکوے تمام شکایتیں ہمارے لئے ندامت کا باعث بنیں گی۔ ہمیں یہ احساس ہو گا کہ زندگی تو عزم و حوصلہ سے تعبیر ہے۔ اس میں تو خود رنگ بھرے ہوتے ہیں۔ خلوص کے رنگ، محبت کے رنگ، ایسے رنگ کبھی ماند نہیں پڑتے۔ نہ سورج کی تیز روشنی میں نہ بارش کی یورش میں میں جب اپنی زندگی کا مطالعہ کرتا ہوں اور اپنا تقابلی مطالعہ اس دنیا کی خاتون اول سے کرتا ہوں تو مجھے میری مشکلات سرے سے مشکلات ہی دکھائی نہیں دیتیں۔ میری کامیابیاں نظر نہیں آتیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہیلن متمول والدین کی بیٹی تھی جو ہر ممکن سہولت اور آسانی اس کے سامنے ڈھیر کر سکتے تھے۔ اس کے بہت سے ملازمین تھے۔ اور اس کے لئے اس کی تعلیم کے دوران ہمہ وقتی معلمہ بھی فراہم کر سکتے تھے۔ وہ دنیا کے جس خطے میں پیدا ہوئی وہاں معذوری بے چارگی تصور نہیں کی جاتی تھی۔ وہاں صلاحیتوں کا اعتراف ہوتا تھا۔ وہاں انسانی ہمدردی کی فصلیں اگتی تھیں۔ سوسن و گلاب کھلتے تھے۔ یقیناً کانٹے بھی تھے لیکن کانٹوں کو ہیلن کبھی خاطر میں نہیں لاتی تھی یہ نابغہ گاہ اپنی بینائی بے سماعتی کے باوجود جریدہ حیات پر انمٹ نقوش ثبت کر گئی۔ 19 ماہ کی عمر میں جس المیے سے وہ دوچار ہوئی کوئی اور ہوتا تو دم توڑ دیتا۔ لیکن فطرت کی مرضی یہ نہیں تھی چنانچہ راستے کھلتے گئے۔ Miss Anne Sulivian جیسی معلمہ سات سال کی عمر میں ہیلن کی زندگی میں داخل ہو گئی۔

مس سولیون کی اپنی بینائی بھی ضائع ہو چکی تھی لیکن علاج کے بعد کچھ بینائی لوٹ آئی تھی۔ جب وہ ہیلن کی معلمہ مقرر ہوئی اس کی عمر بیس سال کی تھی اور اس نے خود پرکنز انسٹی ٹیوشن فار دی بلائنڈ سے گریجوایشن کی ڈگری حاصل کر رکھی تھی یہ ادارہ بوسٹن میں واقع تھا جو Massachusetts کی ریاست میں ہے۔ مس سولیون کی آمد ہیلن کی زندگی میں ایک انقلاب سے کم نہ تھی اس نے ایک ہی ماہ میں ہیلن کو زبان سے کچھ واقفیت کرا دی۔

اس کی مدد سے ہیلن نے ریڈ کلف کالج سے 1904ء میں گریجویشن کی ڈگری حاصل کر لی۔ پھر بھی مس سولیون کی رہنمائی ہیلن کو حاصل رہی۔ مس سولیون 1936ء میں وفات پا گئی۔ ہیلن کی جدوجہد حیرت انگیز تھی جس کا ذکر اس نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں تفصیل سے کیا۔ اس میں اس کے تعلیمی دور کی جدوجہد اور فتوحات کا ذکر ہے۔ 1903ء میں ہیلن کی کتاب Optimism شائع ہوئی۔ 1910ء میں اس کی ایک اور تصنیف بنام The World I live in. منظر عام پر آئی۔ اس طرح ایک اور کتاب My Religion 1927ء میں شائع ہو گئی۔ Mid stream 1929ء میں

Helen Keller,s Journal 1938ء میں اس نے بے شمار کتابیں پڑھیں اور اپنی زندگی اور کتب کے تجربات کو اپنی کتب میں تحریر کیا۔ پھر 1946ء اور 1948ء میں وہ یورپ اور جاپان گئی اور مختلف ممالک کا اپنے تمام حواس سے مشاہدہ کیا۔ وہ حواس جو قوت ارادی نے توانا کر دیئے تھے۔ وہ 1956ء میں پاکستان بھی آئی اور اس نے کئی شہروں کا دورہ کیا۔ نابیناؤں اور بے سماعت بچوں کے اداروں میں گئی اور انہیں کوشش کرتے رہنے کی تلقین کی۔ ہیلن کا ایک مضمون Three Days to See اس کے ذہن کا خوبصورت مطالعہ ہے۔ جسے پڑھ کر ہمیں اس کے ہمہ جہتی مشاغل اور رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔ اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اسے بینائی کی نعمت اور سماعت کی نعمتوں کا پورا احساس ہے۔ اسے افسوس ہے کہ بینا لوگ بینائی کو سرسری سمجھتے ہیں اور انہیں اس نعمت کا سرے سے احساس ہی نہیں۔ نہ انہیں قدرت کی رنگا رنگی اور بوقلمونی کا کوئی احساس ہے اور نہ ہی تاحد نظر بکھیرے ہوئے مناظر کا اور قدرت کی دلگیر نعمتوں کا۔ اس کی خواہش ہے کہ اگر تین دن کے لئے اسے بینائی مل جائے تو وہ اپنی آنکھوں کی پوری پیاس بجھائے گی۔ پہلے روز وہ فطرت کے مناظر سے لطف اندوز ہو گی ان مہربان چہروں کو دیکھے گی جنہوں

نے اس کی زندگی کو مفید بنایا۔ اپنے اساتذہ کے چہروں کو رشتہ داروں کے چہروں کو۔ یہاں تک کہ وہ اپنے کتے کا بھی اپنی بینائی سے مشاہدہ کرے گی۔ دیوار پر لگی ہوئی تصاویر دیکھے گی۔ میز پر رکھی ہوئی کتب کا مشاہدہ کرے گی۔ فرش پر پڑی ہوئی اشیاء کو بھی دیکھے گی۔ پھر جنگل میں جائے گی دوپہر اور شام کے مناظر سے لطف اندوز ہو گی۔ دوسرے روز عجائب گھر جائے گی اور ماضی کی تہذیب اور ثقافت کا مطالعہ کرے گی۔ ادیبوں شاعروں اور مصوروں کے مجسمے دیکھے گی شام کو تھیٹر جائے گی شیکسپیئر کے ڈراموں سے لطف اندوز ہو گی۔ تیسرے روز وہ نیویارک کی عمارات دیکھے گی۔ غریبوں کی بستیوں کی سیر کرے گی اور پھر تھیٹر جائے گی۔

ان خواہشات سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ ہیلن کا ذوق کتنا متنوع تھا اسے زندگی سے کتنا پیار تھا۔ اس کی شخصیت ہمہ پہلو تھی۔ وہ ہر چیز کو دیکھنا چاہتی تھی۔ 19 ماہ کی عمر میں کسی بچے کا بینائی اور سماعت کھو بیٹھنا اور گفتگو کرنے کے قابل بھی نہ ہونا زندگی کا فقید المثال المیہ تصور کیا جانا چاہیے۔ ایسا بچہ حرکت کرنے والے گوشت کے لوتھڑے کے سوا اور کیا ہو گا مگر قدرت کے انداز پر اسرار ہیں۔ اس نے اشیاء اور افراد میں اپنی عظمت کے نشان ثبت کئے ہوئے ہیں۔ وہ چاہے تو پتھر میں کیڑے کی پرورش کر دے وہ چاہے تو خوفناک طوفان میں ایک جھونپڑی کو بچا لے۔ وہ چاہے تو ایک گونگی بہری اور بے بصر بچی کو وہ نعمتیں دے دے۔ ایسی صلاحیتیں عطا کر دے کہ ہر پڑھنے والا کہہ اٹھے کہ "فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰن" حقیقت یہ ہے کہ قدرت کا نظام بے نکا نہیں۔ جہاں اس نے ہیلن کو جنم دیا وہاں مس سولیون کو بھی اس کی زندگی میں مینارہ نور بنا کر وارد کر دیا۔

ہیلن نے اپنی تمام زندگی معذور بچوں کی خدمت میں صرف کی اور پرکنز انسٹی ٹیوٹ کے لئے گراں بہا خدمات سر انجام دیں۔ ہیلن کی پوری زندگی ایک ایسی جدوجہد سے

عبارت ہے۔ جس کی حرارت سے کاروان حیات تمام مشکلات کے باوجود آگے بڑھتے رہنے کی صلاحیتوں سے فیضیاب ہو سکتا ہے جس کے سامنے مایوسیاں دم توڑ دیتی ہیں۔ اور حوصلے جنم لیتے ہیں۔ ارادے پھوٹتے ہیں اور عزائم پروان چڑھتے ہیں لیکن افسوس کی بات یہ ہے اب بھی معاشرتی رویوں میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی نہیں آئی۔ اب بھی بینائی سے محروم سماعت سے عاری بچوں کو بے مصرف اور بے کار سمجھا جاتا ہے۔ یا تراحم کے چند ٹکڑے جھولیوں میں ڈال دیئے جاتے ہیں۔ لیکن ہیلن نے کہا تھا اور کیا خوب کہا تھا۔

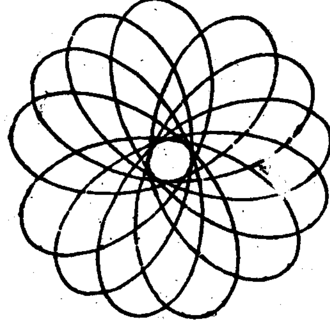
They said it could not be done when it was being done.

اس کی شخصیت اور مزاج کا مطالعہ بھی اسی طرح کم اہم نہیں جس سے اس کی فکر اور جدوجہد کے نئے در وا ہوتے ہیں اور قارئین کے لئے کسی طرح دلچسپی سے خالی نہیں۔ Marktwain نے کہا کہ انیسویں صدی میں دو دلچسپ شخصیات ابھریں۔ (Helen Kaller and Napoleon)۔ ہیلن کیلر ایک دراز قد اور مضبوط جسم کی مالک تھی اور اس کے اعصاب بھی بڑے مضبوط تھے جب ہیلن کیلر بولتی تو اس کا چہرہ اظہار سے دمک اٹھتا اور اس کے سارے رنگ ظاہر ہونے لگتے۔ جب وہ کسی آشنا سے بات کر رہی ہوتی تو اس کے ہاتھ اس کے چہرے پر لگتے اور وہ منہ کی جنبش سے بہت سے اندازے کر لیتی۔ اس کی یاداشت بلا کی تھی۔ جو انگلیاں اسے چھوتیں وہ ان کا بڑی آسانی سے اندازہ کر لیتی۔ اپنی تمام تر مشکلات کے باوجود اس کے مزاج میں شوخی تھی۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ پڑھنا چاہتی ہے۔ اس نے جواب دیا کہ میں کھیلنا چاہتی ہوں۔ ڈاکٹر Furness نے اسے انتباہ کیا کہ شیکسپیئر کے بارے میں زیادہ کھوج لگانے کی ضرورت نہیں جو کچھ ہمیں معلوم ہے بس وہ اتنا ہے کہ شیکسپیئر کو Baptise کیا گیا۔ اس نے

شادی کی اور وہ مر گیا۔ ہیلن نے جواب دیا تو پھر اس نے تمام ضروری کام تو کر لئے اس کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ وہ سب کچھ کر گزرے جو کچھ کر گزرے جو دوسرے کرتے ہیں۔ اور اس میں وہ پوری طرح کامیاب بھی رہی اور کبھی مایوس نہیں ہوئی۔ کسی نے اس کے کوٹ کا رنگ پوچھا اس نے کوٹ کو چھوا اور کہا کہ یہ کالا رنگ ہے اور اگر کسی نے کہا کہ یہ نیلا ہے تو اس نے ہنس کر کہہ دیا کہ اسے یہ بات معلوم ہے۔ ہیلن ہمیشہ لوگوں کے درمیان رہنا چاہتی تھی۔ سن نہیں سکتی تھی پھر بھی اس نے موسیقی سے اور بالخصوص پیانو سے بڑی دل بستگی قائم کر لی تھی۔ وہ آواز کو چھونے کی کوشش کرتی تھی۔ وہ ہوا کے زیر و بم سے گلے کی جنبش سے اور سانس کی حرکت سے موسیقی کا تصور کیا کرتی۔ اس کے علم کا بہت بڑا حصہ کتابوں کا رہین منت تو تھا ہی لیکن مشاہدے نے بھی اس میں بڑا کردار ادا کیا۔ وہ جہاں کہیں جاتی ہر چیز جاننے کی کوشش کرتی۔ اگر اس کی معلمہ اس کے ہاتھ پر نہ لکھ پاتی وہ گفتگو کا موضوع ضرور لکھ دیتی اس طرح ہیلن گفتگو کا کچھ اندازہ ضرور لگا لیتی۔ مس سولیون اس کے ہاتھ پر حروف تو لکھتی تھی لیکن اس نے کچھ اشارے بھی وضع کر لئے تھے جنہیں وہ اس کے ہاتھ پر محسوس کرواتی۔ بہت سے لوگ اسے کتابیں بریل میں لکھ کر دے دیتے اور اس سلسلے میں وہ خاصی خوش قسمت تھی۔ اس کے پاس تمام حسیات تو نہیں تھیں لیکن جو حسیات باقی رہ گئی تھیں اس سے ہیلن نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ سونگھنے کی قوت سے اس نے بہت سے پھولوں کا لطف اٹھایا اور بہت سے چیزوں کی شناخت کی زندگی کے بارے میں اس کا رویہ رجائی تھا اسے دنیا میں شر سے زیادہ خیر محسوس ہوتی تھی۔ قوت برداشت اس کے نزدیک بہت بڑی خوبی تھی۔ اسے دوسروں کے ساتھ بے پناہ ہمدردی تھی۔ اس نے اپنی کتابوں اور مضامین سے جو کچھ کمایا معذورین کی بھلائی کے لئے استعمال کیا اس نے 1968ء میں وفات پائی۔

تادم آخر اس کی خواہش یہی رہی کہ وہ معذورین کے کام آسکے اور ان کی خوشیوں میں اضافہ کر سکے ان کی مشکلات کم کر سکے۔ مس سولیون کے علاوہ ڈاکٹر Howe کا بھی اس کی زندگی پر بڑا اثر تھا۔ کیونکہ اس نے بے سماعت اور بے بصر لوگوں کے لئے گراں بہا خدمات سرانجام دیں۔ وہ بوسٹن میں 1801ء میں پیدا ہوا اور 1876ء میں چل بسا لیکن اس نے جو کچھ کیا اس سے بلاواسطہ طور پر ہیلن کی زندگی متاثر ہوئی۔ اس نے معذورین کے لئے عوامی رویوں کو تبدیل کیا۔ پرکنز انسٹی ٹیوشن فار دی بلائنڈ کے سربراہ کے طور پر اس نے بے پناہ کام کیا۔ Laura Bridgman ابھی آٹھ سال کی تھی کہ ڈاکٹر Howe اسے اپنے ادارے میں لے آئے۔ Laura چھبیس سال کی تھی کہ اپنی بینائی اور سماعت کھو بیٹھی وہ سونگھنے اور چکھنے کی قوت سے بھی محروم ہو گئی۔ اس نے اسے ابھرے ہوئے الفاظ سے پڑھانا شروع کیا اور پھر بریل بھی سکھا دی۔ اسی کی کامیابی سے ہیلن کی کامیابی کی راہیں استوار ہوئیں۔ مس سولیون نے اس کی زندگی کو کامیابی کے سانچوں میں ڈھال دیا۔ مس سولیون جو زندگی کے آغاز میں بینائی سے مکمل طور پر محروم رہ چکی تھی۔ وہ خود 1880ء میں پرکنز انسٹی ٹیوشن میں داخل ہوئی جب کہ وہ صرف چودہ سال کی تھی پھر اس کی بینائی قدرے بحال ہو گئی۔ یہ تجربہ اس کی زندگی میں بڑا اہم تھا۔ جس کے باعث وہ ہیلن کی مشکلات کو قدرے بہتر سمجھ سکتی تھی۔ چونکہ وہ خود بھی گریجوایٹ تھی اور تدریس کے اصولوں سے واقف تھی۔ اس نے ان سے خوب خوب فائدہ اٹھایا اور ہیلن کو زندگی سے پوری طرح آشنا کرانے میں کامیاب رہی۔ یوں یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ فطرت کے طریقے بڑے پراسرار ہیں وہ جسے چاہے جتنا نواز دے اور ظاہری اسباب منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔ ہیلن کی زندگی جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ وہ مینارۂ نور ہے۔ جس کی کرنیں اندھیروں کو خوں آشام ہونے نہیں دیتیں اور بے سماعت اور بے بصر افراد کو

حوصلہ عطا کرتی ہیں۔ جس کے بل بوتے پر بڑی سے بڑی مشکلات پرِکاہ نظر آتی ہیں۔ فطرت ایسی شخصیات کی تخلیق اپنے شاہکار کے طور پر کرتی ہیں۔ یقیناً ہیلن دستِ قدرت کا بہت بڑا شاہکار تھی۔



باب دوم

لوئی بریل

حیرت انگیز شخصیات مافوق الفطری کارناموں سے عبارت نہیں ہوتیں بلکہ اپنی محنت شاقہ اور سعی مسلسل کے باعث حیرت انگیز کارناموں کے بل بوتے پر جریدہ حیات پر ہمیشہ کے لئے ثبت ہو جاتی ہیں۔ ایسی شخصیات ہی میں سے فرانس کی ایک نابینا شخصیت بھی ہے۔ جس کے نام پر بے بصر حضرات کے پڑھنے لکھنے کے لیے طریق کار کا نام رکھا گیا کیونکہ یہ لوئی بریل کے نام کا ایک حصہ ہے۔ لوئی بریل کی زندگی دنیائے تگ و تاز میں ہمیشہ مینارہ نور ثابت ہو گی۔ اس کی زندگی ایک عام انسان کی زندگی کی طرح شروع ہوتی ہے لیکن آہستہ آہستہ ایک غیر معمولی اہمیت اختیار کر لیتی ہے۔

لوئی بریل کا والد گھوڑوں کی زینیں بنایا کرتا تھا جو پورے فرانس میں مقبول تھیں۔ لوگ اس کے والد سائمن بریل کے پاس کوسوں دور سے آتے اور اپنے گھوڑوں کے لئے زینیں خریدتے۔ لوئی ان تمام لوگوں سے ملتا ان کی باتیں سنتا اور تنہائی میں انہیں یاد کر کے خوش ہوتا۔ لوئی کا باپ چمڑے کا ایک بڑا ایپرن پہن کر کام کرنا شروع کر دیتا۔ لوئی اگرچہ اپنے والد کی کوئی مدد تو نہیں کر سکتا تھا لیکن وہ اسے کام کرتے دیکھ کر بہت خوش ہوتا تھا۔ ابھی وہ تین سال ہی کا تھا کہ اس کے دل میں کام کرنے کا جذبہ بیدار ہو گیا تھا۔ وہ اپنے والد کے مختلف ہتھیاروں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا لیکن اس کا والد اسے بتاتا کہ وہ بہت خطرناک ہیں اسے ان سے بچنا چاہیے۔ لوئی نے وعدہ کر لیا کہ وہ انہیں نہیں چھوئے گا۔ لیکن بعض وعدے نبھانا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ گرمیوں کے ایک دن لوئی ادھر ادھر پھر رہا تھا اس کے پاس کرنے کے لئے کچھ بھی تو نہیں تھا۔ ہر شخص تو مصروف تھا۔ اتنا مصروف کہ اس سے باتیں نہیں کر سکتا تھا۔ ہاں لوئی اکیلا کھیل سکتا تھا۔ لیکن جانے کیوں

اس کا کھیلنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ لوئی نے اپنی ماں کا کام میں ہاتھ بٹانا چاہا جو باغ میں پتے صاف کر رہی تھی لیکن ماں نے اسے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ چنانچہ لوئی اپنے باپ کی ورکشاپ کے سامنے پہنچ گیا اسے چمڑے کی بو بہت اچھی لگنے لگی۔ وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس نے چمڑا اور ایک آر اٹھالی اور چمڑے میں سوراخ کرنے لگا چمڑا پھسل گیا اور ساتھ ہی آر لوئی کی آنکھ میں جا لگی لوئی چیخا، ماں دوڑتی ہوئی آئی اس کی آنکھ کو صاف کیا اور ڈاکٹر کو بلوایا لیکن اس کی آنکھ بری طرح زخمی ہو چکی تھی۔ لوئی نے اسے ملنا شروع کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا اثر دوسری آنکھ تک بھی پہنچ گیا۔ اسے ایسا لگا کہ ہر طرف اندھیرا سا چھا گیا ہے۔ اگرچہ اب بھی وہ کچھ نہ کچھ دیکھ سکتا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی بینائی اسے بالکل چھوڑ گئی۔ دھوپ چھاؤں تک کا فرق ختم ہو گیا۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہو گیا ہے۔ "کب صبح ہو گی" وہ اکثر پوچھتا اور سب کتنے دکھی ہوتے سب کو معلوم ہو گیا تھا کہ جس صبح کی وہ بات کر رہا ہے اب وہ کبھی طلوع نہیں ہو گی۔

اس کے بعض ساتھی سکول جانے لگے تھے لیکن اب وہ سکول نہیں جا سکتا تھا۔ بے بصر حضرات کے لئے اس کے گاؤں میں پڑھنے لکھنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ نابینا بچے کچھ بھی تو نہیں کرتے تھے۔ بڑے ہو کر وہ بوجھ اٹھانے کا کام کر لیتے یا پھر بھیک مانگتے۔ کسی گلی کے کونے پر کشکول گدائی لئے ہوئے کئی نابینا دیکھے جا سکتے تھے۔ پھٹے پرانے کپڑے ان کا نصیب تھا۔ اندھیری گلیوں میں وہ بسیرا کرتے تھے۔ بمشکل نان شبینہ انہیں میسر آتی تھی۔ کوپ ورے جو لوئی کا گاؤں تھا کوئی اتنا بڑا بھی نہیں تھا کہ وہاں بہت سی سہولتیں ہوتیں۔ اس کے ماں باپ بہت پریشان تھے ان کا بچہ کیا کرے گا ان کی خواہش تھی کہ کم از کم وہ باعزت زندگی ضرور گزارے۔ لوئی ایک جگہ نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ چلنے پھرنے کو اس کا جی بہت چاہتا تھا جب وہ چلتا تو اسے ٹھوکریں لگتیں ماں باپ بہت ملول ہوتے لیکن وہ چاہتے تھے کہ وہ بے کار ہو کر نہ رہ جائے۔ سائمن نے اسے چمڑے پر پالش کرنا سکھایا۔

لوئی چمڑے پر چمک محسوس تو نہیں کر سکتا تھا لیکن اسے اتنا معلوم ہو جاتا تھا کہ چمڑا نرم ہو گیا ہے۔ شائمن نے اسے چمڑے کی جھالریں بھی بنانا سکھا دیا۔ لوئی اپنی ماں کی مدد بھی کیا کرتا تھا۔ اس کے ساتھ میز اٹھوا دیتا اس کے برتن الماریوں میں رکھ دیتا۔ پینے کے لئے پانی لے آتا اگرچہ پانی لاتے وقت وہ کئی بار لڑکھڑا جاتا لیکن اسے پھر بھی اچھا لگتا۔ اس کے باپ نے اس کے لئے ایک چھڑی تیار کر دی جس کی مدد سے وہ زیادہ آسانی سے چلنے لگا۔ اسے سامنے کی رکاوٹوں کا اندازہ ہونے لگ گیا اور کبھی کبھی وہ چھڑی کے بغیر بھی سامنے کی رکاوٹ کا اندازہ لگا لیتا۔ وہ گنگناتا ہوا چلتا اور اس کا خیال تھا کہ گنگنانے سے اسے رستے کا زیادہ بہتر اندازہ ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ چمگادڑوں کی طرح آواز سے اندازہ لگا لیتا تھا کیونکہ شعاعیں چیزوں سے ٹکرا کر شاید اس کے کانوں تک پہنچ جاتی تھیں۔ لوئی بہت کچھ سیکھ رہا تھا چھڑی کی مدد سے وہ ہر جگہ چل پھر لیتا۔ کبھی کبھی رستہ بھی بھول جاتا تو کبھی دل میلا نہیں کرتا تھا۔ وہ کچھ اشاروں کی مدد سے بھی جگہ کا اندازہ لگا لیتا۔ جب وہ کسی تنور کے پاس پہنچتا تو آگ کی حرارت سے اسے اس کا اندازہ ہو جاتا۔ اشیاء کی بو سے بھی وہ مختلف مقامات کا اندازہ کر لیتا۔ آوازوں سے بھی اسے بہت سے مقامات کا پتہ چل جاتا۔ گرجے کی گھنٹیاں اسے جگہ کا پتہ دے دیتیں۔ کتوں کے بھونکنے پرندوں کے چہچہانے اور دیگر مختلف آوازوں سے اسے اندازہ ہو جاتا کہ وہ کہاں پہنچ گیا۔ چلتے پھرتے لوگوں سے ملتا اور ان کی آسانی سے شناخت کر لیتا۔ کسی کی کھانسی، کسی کے چلنے کا انداز، کسی کی ہنسی اسے سب کچھ بتا دیتی کہ اس کے قریب سے گزرنے والا کون ہے۔

لوئی بہت کچھ سننا چاہتا تھا لیکن کچھ باتیں ایسی تھیں جو وہ سننا بھی نہیں چاہتا تھا۔ کبھی کبھی چلتے پھرتے اسے کسی کی آواز سنائی دیتی۔ "دیکھو بے چارہ لوئی جا رہا ہے ہائے افسوس" لوئی کو بہت دکھ ہوتا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے کوئی بے چارہ کہے۔ اسے معلوم تھا کہ وہ دوسروں سے مختلف ضرور ہے لیکن عجیب و غریب نہیں۔ وہ جانتا تھا کہ وہ بہت

سے کام نہیں کر سکتا تھا۔ آنکھ مچولی نہیں کھیل سکتا تھا۔ دوڑ کر کسی کے گھر نہیں جاسکتا۔ لیکن پھر بھی خوش رہتا تھا بہت خوش. بہت ہی مطمئن۔ لیکن کبھی کبھی وہ اداس بھی ہو جاتا "کیا سوچ رہے ہو لوئی" اس کے والدین کہتے "کچھ بھی تو نہیں" لوئی عام طور پر جواب دیتا۔ جب لوئی چھ سال کا ہو گیا تو اس کی ملاقات ایک نیک دل پادری فادر جیکس پالے (FATHER JACQUES PALLUY) سے ہوئی جو گاؤں کے کلیسا میں متعین ہوا تھا۔ اس نے لوئی کی زندگی میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔ وہ لوئی کے والدین سے ملنے آیا اور اس نے بچے کے چہرے پر ذہانت کی چمک محسوس کی۔ اور اسے کلیسا لے گیا اور پھر لوئی اپنی رفیق چھڑی کی مدد سے ہر صبح کلیسا پہنچ جاتا۔ فادر پالے نے اسے تاریخ اور سائنس بھی پڑھانا شروع کر دیا۔ وہ اسے اکثر و بیشتر بائبل سے اچھے، برے، بہادر اور نیک لوگوں کی کہانیاں سناتا۔ لوئی اپنے سبق میں بھی بہت دلچسپی لیتا اور کبھی کبھی بہت مشکل سوالات بھی کر دیتا۔ فادر پالے کو خیال ہوا کہ اسے کسی سکول میں داخل کرا دے اور وہ ایک سکول کے استاد (ANTOINE BECHERET) آنٹائن بیچرٹ سے ملا۔ Becheret نے کبھی کسی نابینا طالب علم کو نہیں پڑھایا تھا اور پھر اسے عجیب خیال آیا کہ کتابیں ایک نابینا بچے کا کیا بھلا کر سکیں گی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بہت زیادہ خواہشات کرنے لگے۔ اور زندگی میں پوری نہ ہو سکیں اور پھر شاید قوانین بھی یہ اجازت نہیں دیتے تھے کہ ایک نابینا بچہ سکول میں داخل کیا جائے۔ "لیکن اسے تو پڑھنے کا بے حد شوق ہے" پادری نے کہا" ہو سکتا ہے یہ سچ ہو لیکن سوچو تو کیا یہ مناسب ہو گا کہ ایک بینا بچے کی جگہ ایک نابینا بچے کو دے دی جائے" استاد نے کہا" پھر سوچو تو عمارت کتنی چھوٹی ہے ایک ہی تو کمرہ ہے" استاد مزید کہنے لگا پادری نے آہ بھری" ہاں تم ٹھیک ہی کہتے ہو" اور جانے لگا لیکن استاد کو کچھ خیال آگیا" ٹھہرو اس طرح مت جاؤ میں نے بچے کو دیکھ لیا ہے وہ چھوٹا سا تو ہے کہیں نہ کہیں اڑا ہی لیں گے" BECHERET نے کہا۔

سکول جانا لوئی کو بہت اچھا لگا دن کی پڑھائی سے طلباء تھک جاتے۔ آٹھ گھنٹے پڑھنا کون سا آسان تھا لیکن لوئی کبھی نہ تھکتا۔ ہاں وہ کتابیں خود نہیں پڑھ سکتا تھا۔ وہ صرف سنتا اور یاد کر لیتا۔ اس کا حافظہ بہت اچھا تھا۔ اسے استاد کا پڑھایا ہوا سبق کبھی نہیں بھولتا تھا مہینوں تک نہیں بھولتا تھا۔ وہ حساب کے سوالات زبانی یاد کر لیتا لیکن جب استاد کہتا "بچو اپنی کتابیں نکالو" لوئی کا دل بیٹھ ہی تو جاتا۔ وہ کبھی کبھی کوئی کتاب اٹھاتا۔ صفحات پر انگلیاں پھیرتا وہ جانتا تھا کہ ان صفحات پر لفظ لکھے ہوتے ہیں لیکن وہ انہیں نہیں پڑھ سکتا تھا۔ یہ سوچ کر اسے بہت دکھ ہوتا۔ وہ اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ جان لے کہ کتابوں میں جانے کیا کیا کچھ لکھا ہوا ہے۔ جو شاید وہ نہیں پڑھ سکے گا۔ کبھی کبھی لوئی کے ذہن میں سوالوں کا طوفان برپا ہو جاتا کوئی بھی تو اس کے سوالوں کا جواب دینے کے لئے فارغ نہیں تھا۔ "کاش کہ وہ خود کتابیں پڑھ سکتا" لوئی حسرت سے سوچا کرتا۔

لوئی دس سال کا ہو گیا تھا پادری پالے اس کے بارے میں متفکر تھا وہ کب تک اس سکول میں رہ سکے گا۔ اسے تو کسی نابیناؤں کے سکول میں ہونا چاہیے لیکن کیا کوئی ایسا سکول ہے۔ یہ نیک دل پادری کو بھی معلوم نہیں تھا۔ اس نے لوگوں سے پوچھنا شروع کر دیا اور اسے معلوم ہوا کہ فرانس میں نابیناؤں کے لئے ایک سکول ہے جسے ROYAL INSTITUTE OF THE BLIND کہتے ہیں۔ اس سکول میں حساب، گرائمر، جغرافیہ، تاریخ، موسیقی اور بہت سے دیگر ہنر بھی سکھائے جاتے تھے اور نابینا بچوں کو لکھنا پڑھنا بھی سکھایا جاتا تھا۔ پادری بہت خوش ہوا اور کسی امیر آدمی سے خط لکھوایا تاکہ جواب یقینی ہو۔ جواب ملا کہ لوئی کو داخل کیا جا سکتا ہے اور پھر پادری بھاگا بھاگا لوئی کے گھر گیا۔ لوئی کے ماں باپ بھی خوش ہوئے اور پریشان بھی۔ لوئی اب ان سے دور چلا جائے گا۔ پیرس ان کے گاؤں سے تیس میل دور تھا۔ لوئی صرف سرما کی تعطیلات میں گھر آ سکے گا۔ بہرحال ماں باپ تیار ہو گئے اور لوئی پیرس کے سکول میں پہنچ گیا۔

سکول میں پہلا دن لوئی کے لئے کسی ڈراؤنے خواب سے کم نہ تھا۔ وہاں کتنے ہی لوگ تھے۔ شور ہی شور تھا کوئی ایک سو نابینا طلبا ادارے میں موجود تھے جن سے لوئی کا تعارف کرایا گیا۔ اس نے ان کے نام یاد کرنا شروع کر دیئے۔ اسے بہت مشکل پیش آئی۔ وہ اتنے سارے لوگوں میں کبھی نہیں رہا تھا۔ خدا خدا کر کے دن گزرا لوئی پہلی بار تنگ سکول کے بستر میں لیٹا۔ ساتھ اور بہت سارے بستر موجود تھے۔ لوئی بہت تھک گیا تھا لیکن نیند کوسوں دور تھی۔ دس سالہ لوئی اپنے گھر سے کبھی دور نہیں گیا تھا۔ اسے گھر کی یاد تو اتنی نہیں ستا رہی تھی لیکن وہ گھبرایا گھبرایا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اپنا سر تکیے پر ٹیک دیا اور رونا شروع کر دیا۔ "مت روؤ" ساتھ والے بستر سے ایک آواز اس کے کان میں آئی۔ ایک رومال بھی اس کی طرف بڑھا اور قریب آ گیا "میرا نام گیبرل GABRIEL ہے۔ GABRIEL GAUTIER گیبرل گاٹیر۔ تمہارا نام کیا ہے "لوئی۔ لوئی بریل" لوئی نے سسکتے ہوئے کہا" سنو لوئی تمہیں نئے داخل ہونے والے بچے کی افسردگی لاحق ہے۔ ہر ایک کے ساتھ ایسا ہوتا ہے میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا گیبرل نے کہا۔ گیبرل نے کچھ تسلیاں دیں اور پھر دونوں سو گئے۔

اگلے کئی دنوں میں لوئی کو بہت سی نئی چیزوں سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ ایک دیہاتی تھا۔ تازہ ہوا اور دھوپ کا عادی لیکن یہاں سب کچھ بدل گیا۔ اب وہ ایک تنگ ماحول میں سانس لے رہا تھا دیہات کی طرح یہاں نہانے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ سب بچوں کے لئے ایک ہی غسل خانہ تھا اور وہ مہینے میں ایک بار نہا سکتے تھے۔ عمارت بڑی تھی لوئی کے لئے چلنا پھرنا خاصا دشوار تھا۔ ہر طرف سیڑھیاں ہی سیڑھیاں دکھائی دیتی تھیں لیکن سب سے زیادہ تکلیف دہ بات لوئی کے لئے رطوبت تھی۔ کیونکہ عمارت دریا کے قریب تھی ٹھنڈی ہوا محسوس ہوتی تھی جب وہ سکول میں آیا تھا تو وہ خوش و خرم تھا صحت مند اور توانا تھا۔ اس کے پھول جیسے گال اب زرد پڑ گئے تھے۔ مرطوب ہوا بچوں کے پھیپھڑوں کو بھی

متاثر کر رہی تھی۔ لوئی اپنے گاؤں کو بری طرح یاد کرتا لیکن آہستہ آہستہ یادیں ماند پڑنے لگیں۔ اس نے بہت سے دوست بنا لیے۔ صبح سے شام تک پڑھنے لکھنے میں محو ہو گیا۔ دس سالہ لوئی سکول میں سب سے چھوٹا بچہ تھا۔ لیکن کارکردگی میں سب سے بہتر۔ "یہ بچہ سیکھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتا۔ اسے کوئی بات دوبارہ بتانی نہیں پڑتی" سکول کے ایک استاد نے کہا۔ شام کے وقت بچے ٹوپیاں، دستانے، جوتے، چابک وغیرہ بناتے۔ لوئی تو پہلے ہی اپنے باپ کو چمڑے کا کام کرتے دیکھ چکا تھا اور ہاتھ کا کام خود کر لیتا تھا۔ اس لئے سال کے آخر میں اسے بنائی اور کفش دوزی میں انعام ملا۔ سکول میں موسیقی بھی سکھائی جاتی تھی۔ لوئی نے بھی موسیقی سیکھ لی اور پیانو میں بڑی مہارت حاصل کر لی۔ جب بھی وہ پریشان ہوتا تو موسیقی سے دل بہلا لیتا۔ نابینا بچے شہر کی پرہجوم گلیوں میں تو پھر نہیں سکتے تھے اس لئے وہ اس طرح اپنا دل بہلاتے۔ ہر جمعرات کو انہیں سیر کے لئے لے جایا جاتا۔ لیکن پیرس کی مصروف گلیوں میں پھرنا کون سا آسان کام تھا۔ چنانچہ رسے کی مدد سے انہیں چلایا جاتا۔ رسے کو پکڑ کر نابینا بچے سیر کے لئے جاتے۔ بچے کبھی کبھی ناپسندیدگی کا اظہار بھی کرتے۔ پیرس کا شہر بہت ہی مصروف شہر تھا لیکن آہستہ آہستہ لوئی نے رستے سیکھنے شروع کر دیئے اور آوازوں کی مدد سے جگہوں کی پہچان کرنے لگا۔ اسے گرجوں کی گھنٹیوں سے ان کی پہچان ہونے لگی۔ وہ کشتیوں کی آواز سے ان کا اندازہ لگانے لگا سپاہیوں کے جوتوں کی پہچان ہونے لگی۔ خواتین کے سرسراتے ہوئے کپڑوں سے وہ ان کی آمد و رفت کا اندازہ لگانے لگا۔ کبوتروں کی پہچان اسے ان کے پر پھڑپھڑانے سے ہونے لگی۔

وقت گزرتا گیا لوئی مطمئن زندگی کی طرف بڑھتا گیا اسے ایک بے اطمینانی تھی وہ یہ کہ وہ کتابیں خود نہیں پڑھ سکتا تھا۔ 1820ء میں نابیناؤں کے لیے پڑھنے کا ایک ہی طریقہ تھا حروف تہجی کو ابھار کر کتابیں تیار کی جاتی تھیں۔ یہ کام بہت مشکل تھا۔ کچھ حرف سادہ

ہوتے اور کچھ بہت پیچیدہ ہوتے۔ انہیں پہچاننا مشکل ہو جاتا۔ Q.S.-O.S نظر آتا۔ O.S.-C.S. محسوس ہوتا۔ T-I کی طرح محسوس ہوتا اور B-R کی طرح۔ بہرحال لوئی بڑی تندہی سے ان کی پہچان کی کوشش کرنے لگا۔ پھر ایک ایک حرف سے لفظ بنانے لگا۔ لیکن یہ طریقہ تو بہت سست تھا۔ فقرہ ختم ہونے تک اس کا آغاز بھول جاتا اور پھر دوبارہ فقرہ پڑھنا پڑتا۔ ایک کتاب پڑھنے میں مہینے لگ جاتے۔ "یہ کیا پڑھائی ہوئی" لوئی نے ایک دن کہا "یہ تو ایک چکر ہے" لیکن استاد بولا "بس یہی کچھ ہم کر سکتے ہیں" اس سے بہتر طریقے تلاش کرنے کی بہت کوششیں ہوئی ہیں۔ "لوئی کیا کرتا اسے بتایا گیا کہ مختلف اشخاص نے کبھی پتھر کبھی رسی کبھی موم اور کبھی لکڑی سے حروف بنانے کی کوشش کی۔ پتوں سے بھی حروف ابجد تیار کئے گئے۔ سکول کی لائبریری میں صرف 14 کتابیں تھیں۔ ابھرتے ہوئے حروف کی کتب پر بے بہا خرچہ اٹھتا تھا۔ اور ان کتابوں کا حجم بہت بڑھ جاتا تھا اور انہیں سنبھالنا بھی کوئی آسان کام نہ تھا۔ ایک حرف کوئی تین انچ کا ہوتا۔ لوئی کا ذہن کچھ سوچنے لگا اسے معلوم تھا کہ کتابوں کے بغیر وہ بہت کچھ نہیں پڑھ سکے گا۔ اس نے اپنے دوستوں کو اس کی اہمیت کا احساس دلایا لیکن وہ کیا کر سکتا تھا۔

1821ء کی بہار کے ایک دن کیپٹن چارلس باربیر CHARLES BARBIER ادارے میں آیا۔ وہ اپنے سپاہیوں کے لئے پیغام رسانی کی خاطر ایک طریقہ دریافت کر چکا تھا جسے وہ NIGHT WRITING یعنی اندھیرے میں پڑھے جانے والی تحریر کہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس سے نابینا بچے بھی مستفید ہو سکتے ہیں۔ یہ تحریر ابھرے ہوئے نقطوں پر مشتمل تھی۔ لفظ آوازوں میں منقسم کیا جاتا اور ہر آواز کے لئے نقطوں کے مختلف نمونے تیار کئے جاتے۔ نقطے موٹے کاغذ میں ایک لمبے نوکیلے اوزار کو ٹھونس کر ابھارے جاتے اس اوزار کو سٹائلش کہا گیا۔ جب کاغذ الٹا جاتا تو ابھرے ہوئے نقاط محسوس کیے جا سکتے تھے۔

نابینا بچوں کی پہلے تو خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی لیکن اس طریقے میں آہستہ آہستہ بہت مشکلات محسوس ہونے لگیں۔ ایک تو یہ کہ اس سے بہت کچھ نہیں لکھا جا سکتا تھا۔ بڑے حروف نہیں بنائے جا سکتے تھے۔ کومہ، سائن آف اسکلیمیشن وغیرہ جیسے نشانات بھی نہیں بن سکتے تھے۔ پھر اس کے لئے جگہ بہت زیادہ درکار تھی۔ اس طریقے کو سیکھنا بھی آسان نہیں تھا۔ یہ طریقہ سپاہیوں کے لئے تو مفید ہو سکتا تھا لیکن لکھنے پڑھنے کے لیے نہیں۔ اس سے کتابیں تیار کرنا بہت مشکل تھا لیکن لوئی کے ذہن میں ایک روشن نقطہ ابھرا اور وہ اس پر کام کرنے لگا۔ وہ نقطوں پر اپنی توجہ کو مرکوز رکھنا چاہتا تھا وہ جانتا تھا کہ وہ نقطوں سے فائدہ اٹھا سکے گا۔ اس نے ایک موٹا کاغذ لیا اور ایک سلیٹ اور ایک لمبا نوکیلا اوزار اور نقطے ابھارتا رہا۔ یہ اوزار آرے سے مماثل تھا جس کی وجہ سے وہ اپنی بینائی کھو بیٹھا تھا۔

جب کیپٹن باربیر کو معلوم ہوا کہ لوئی اس کے انداز تحریر کو بہتر بنانے کی کوشش کر رہا ہے تو وہ سکول پہنچا۔ لوئی کو بہت خوشی ہوئی کہ اسے کوئی اہم آدمی ملنے آیا ہے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ اس کی مساعی کی تحسین کرے گا یا تنقیص۔ کیپٹن لوئی کو چھڑی کے ساتھ چلتے ہوئے اور اس کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ اس کا تو خیال تھا کہ وہ کوئی بڑی عمر کا فرد ہو گا بارہ سالہ بچہ نہیں۔ لوئی کپتان کے چہرے کے تاثرات کو محسوس نہیں کر سکتا تھا لیکن وہ اس کی آواز کی سرد مہری کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ "تم نے میرے انداز تحریر کو بہتر بنانے کی کوشش کی ہے" کپتان بولا "جی ہاں ـــــ جی ہاں" لوئی نے جواب دیا۔ لوئی نے اپنی کوشش کی وضاحت کرنا چاہی مگر کپتان نے اس کی ہر بات سنی ان سنی کر دی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو نابیناؤں سے ہمدردی تو کر سکتے تھے، لیکن یہ توقع نہیں کر سکتے تھے کہ وہ کوئی مفید کام سرانجام دے سکتے ہیں۔

جب لوئی اپنے طریقے کی وضاحت کر چکا تو کیپٹن بے توجہی سے اٹھ کر چلا گیا کیونکہ اسے یہ کوشش پسند نہیں آئی تھی۔ لوئی کو سخت افسوس ہوا اس نے سوچا کہ اسے تن تنہا یہ

کام جاری رکھنا ہو گا۔ لوئی ہر وقت نقطے ابھارتا رہتا۔ صبح شام رات گئے کبھی پوری پوری رات۔ جب وہ گاؤں جاتا وہاں بھی اسی کام میں مصروف رہتا۔ اسے دوسرے کام بھی کرنے ہوتے تھے پھر بھی اپنا سارا باقی وقت وہ اسی کام میں لگا رہتا۔ اس کے ساتھی پریشان تھے کہ کہیں اس کی صحت خراب نہ ہو جائے کیونکہ وہ کئی بار کھانا کھانا بھی بھول جاتا اس کوشش میں تین سال گزر گئے کبھی کبھی لوئی اکتا بھی جاتا۔ کتنے لوگ کوئی ایسا طریقہ دریافت کرنے کی کوشش کرتے رہے تھے سب ناکام رہے تھے لیکن لوئی کو جنون سا ہو گیا تھا وہ ضرور کوئی طریقہ نکالے گا وہ نقطوں کو استعمال میں لائے گا۔

بالآخر اس نے چھ نقطوں پر کام کرنا شروع کر دیا ایک نقطہ A کے لئے ہو گا اور ایک اور دو B کے لئے اور پھر چھ نقطوں کے مختلف نمونوں سے اس نے حروف تہجی تیار کر ہی لیے۔

لوئی ان حروف پر انگلیاں پھیرتا رہتا تھا۔ کتنا سادہ اور سیدھا انداز تھا۔ پندرہ سالہ لوئی بریل کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ خوشی سے اس کی چیخ نکل گئی۔ تمام حروف بن چکے تھے۔ اسے فکر لاحق تھا کہ رد عمل کیا ہو گا۔ لیکن ہوا یوں کہ اس کے ساتھیوں نے اسے بے حد پسند کیا۔ کسی نے کہا "یہ تو بہت ہی سادہ طریقہ ہے" "کتنی آسانی سے اسے چھوا جا سکتا ہے" دوسرے نے کہا" ہماری انگلیاں کتنی آسانی سے محسوس کر لیتی ہیں ایک اور بولا کسی نے کہا "اب ہم ایک دوسرے کو خط بھی لکھ سکتے ہیں" "ہم ڈائریاں بھی بنا سکتے ہیں" "ہم کلاس میں نوٹس بھی لے لیا کریں گے" "اور انہیں پھر پڑھ بھی سکیں گے" "اور کتابیں بھی تیار ہو جائیں گی" لوئی نے دھیمے انداز میں کہا۔

یہ خبر سارے سکول میں پھیل گئی سکول کے ڈائریکٹر ڈاکٹر پگنیر نے لوئی کو بلوایا۔ لوئی نے طریق کار کی وضاحت کی اور انگلیوں سے چھو کر دیکھا۔ ڈاکٹر PIGNIER بہت خوش ہوا بلکہ اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی "تمہاری عمر کیا ہے" اس نے پوچھا

"پندرہ سال" لوئی نے جواب دیا۔ "لوگ صدیوں سے ایسا طریقہ تلاش کرتے رہے ہیں میرے اپنے طالب علم نے اسے تلاش کر لیا ہے" ڈائریکٹر نے خوشی سے کہا لوئی. بہت خوش تھا اس نے سوال کر دیا "جناب ہم کتابیں لکھنا کب شروع کریں گے" ڈائریکٹر کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ ادارہ خیراتی تھا جس کے پاس اپنی کوئی آمدنی نہیں تھی لوئی نے تجویز پیش کی کہ امیر لوگوں کو خط لکھے جاسکتے ہیں۔ ڈاکٹر پگنیر تیار ہو گیا لیکن اس نے لوئی سے کہا کہ نتائج کے بارے میں. بہت پر امید ہونے کی گنجائش نہیں. بہر کیف خط لکھے گئے۔ لوگ دولت مند تھے بااثر تھے لیکن. بہت کم جواب آئے۔ جو جواب آئے وہ بھی کوئی حوصلہ افزا نہیں تھے کسی نے لکھا کہ طریقہ تحریر میں تبدیلی کی کیا ضرورت ہے؟ کسی نے لکھا کہ ابھرے ہوئے حروف کی کتب کے لئے اس نے حال ہی میں تو امداد بھیجی تھی۔ کچھ لوگوں نے تعریفیں کیں لیکن کوئی عملی مدد نہیں ہوئی۔ سال گزرنے لگے کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ لیکن لوئی کے سکول کے بچے لوئی کے حروف ابجد استعمال کرنے لگے۔ لیکن یہ تو صرف 100 طلبار تھے لاکھوں نابینا طلبار اسے کیسے استعمال کریں گے۔ لوئی. بہت پریشان تھا۔

لوئی نے 19 سال کی عمر میں GRADUATION کا امتحان پاس کر لیا لیکن اس نے سکول نہیں چھوڑا۔ لوئی سکول میں اپنی ذہانت کا سکہ بٹھا چکا تھا۔ وہ ہر سال انعام لیتا۔ کبھی گرامر میں کبھی تاریخ میں کبھی جغرافیہ میں اور حساب میں۔ ڈاکٹر پگنیر اسکی صلاحیتوں کا معترف تھا۔ اور اس نے اسے سکول میں ٹیچر متعین کر لیا۔ لوئی کو. بہت خوشی ہوئی۔ وہ یہاں رہنا چاہتا تھا یہاں رہ کر وہ. بہتر کام کر سکتا تھا۔ اسے سکول سے محبت بھی ہو گئی تھی اب یہی اس کا گھر بن گیا تھا۔ گو تنخواہ زیادہ نہ تھی اسے صرف 15 فرینکس ماہانہ تنخواہ ملتا تھی۔ لیکن وہ خوش تھا لوئی کو تدریس. بہت پسند تھی۔ وہ بچوں کے لئے بڑی محنت سے سبق تیار کرتا۔ وہ رات کو سوچتا کہ اسے کل کس طرح پڑھانا ہے اور اپنے خیالات کو لکھ لیتا

اپنے ایجاد کردہ طریقہ تحریر میں۔ لوئی کے طالب علمی کے دنوں میں اساتذہ کبھی نرمی کا سلوک نہیں کیا کرتے تھے۔ چلا چلا کر کرخت آواز میں پڑھاتے تھے۔ کمزور لڑکوں کا مذاق اڑاتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ تعلیم ذہن میں ٹھونسی جاتی ہے لیکن لوئی کو یہ سب کچھ پسند نہیں تھا وہ بہت نرم خو تھا۔ وہ اپنے کسی طالب علم کا مذاق نہیں اڑاتا تھا۔ وہ چھوٹے بچوں سے زیادہ محبت سے سلوک کرتا تھا۔ لوئی سکول میں بہت دیر تک استاد رہا۔ لیکن اسے یہ کبھی نہیں بھولا کہ شروع شروع میں وہ کتنا شرمایا کرتا تھا اور کتنی تنہائی محسوس کرتا تھا تاہم آہستہ آہستہ وہ سنبھل گیا اور پھر بطور استاد وہ اپنے کام کو انتہائی تندہی سے سرانجام دیتا تھا۔ اسے بہت سے طلبار کو پڑھانا پڑتا اور بہت کام کرنا پڑتا۔ بے پناہ مصروفیت کے باوجود وہ اپنے دوستوں کے لئے وقت ضرور نکال لیتا تھا اور ان کے دکھ سکھ میں شریک ہوتا تھا۔ اسے اپنی موسیقی بھی نہیں بھولی تھی اور فارغ لمحوں میں پیانو ہی اس کا ساتھی ہوتا تھا۔ موسیقی سے اس کی دل بستگی نے اسے سینٹ نکولا چرچ میں اہم مقام دلا دیا تھا اور لوگ یہ سمجھنے لگے تھے کہ ایک دن وہ بہت بڑا موسیقار بن جائے گا بشرطیکہ وہ موسیقی ہی سے وابستہ رہے۔ موسیقی اس کے جذبوں کی آبیاری کرتی تھی لیکن اس کا پہلا عشق حروف تہجی تھا اور پہلا عشق سر چڑھ کر بولتا ہے۔ اس عشق نے اسے کبھی چین نہ لینے دیا۔ جب بھی وقت ملتا وہ نقطوں کے مختلف نمونے بنانے میں مصروف رہتا اور اس نے موسیقی کے سروں کے لیے بھی نقطے تراش لئے تھے۔ علاوہ ازیں کتابیں لکھنا (ابھرتے ہوئے نقاط میں) ہی اس کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ وہ دوستوں سے کتابیں سنتا اور اپنے مخصوص نقطوں کے سسٹم میں منتقل کر لیتا یہ طریقہ کار بہت ہی سست اور سخت تھا۔ اس کے لئے اسے گھنٹوں بیٹھنا پڑتا یہاں تک کہ اس کی کمر میں درد ہو جاتا اور انگلیاں سوج جاتی تھیں۔

لوئی یہ کام ہمیشہ کے لئے جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس کے لئے کبھی کبھی بستر

سے اٹھنا بھی محال ہو جاتا اور وہ بہت تھک جاتا۔ کبھی کبھی وہ یہ کہتا کہ اگر وہ رات بھر آرام سے سو لے تو وہ رو بصحت ہو جائے گا۔ اس کی صحت بگڑتی گئی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے اس کا سانس پھول جاتا اس کی آواز بہت کمزور ہو گئی اور اسے بخار کی شکایت رہنے لگی۔ وہ کپکپی محسوس کرنے لگا۔ اسے کھانسی کا حملہ بھی ہوا جو بد سے بد تر ہوتا گیا۔ ڈاکٹر اس کا معائنہ کرنے کے بعد خاموش سا ہو گیا۔ وہ اسے حقیقت نہیں بتانا چاہتا تھا لیکن لوئی کو خود بھی محسوس ہو گیا تھا کہ تپ دق نے اسے آلیا ہے کیونکہ مرطوب ماحول میں یہی کچھ ہو سکتا تھا نہ وہ تازہ ہوا لے سکتا تھا اور نہ ہی آرام کرنا چاہتا تھا اور اسے معلوم تھا کہ یہ بیماری لاعلاج ہے۔ ابھی تو وہ 26 سال کا تھا۔ وہ مرنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اسے اپنے حروف تہجی سے بہت پیار تھا۔ جس کے ذریعے وہ لائبریری کے لئے زیادہ سے زیادہ کتب لکھ دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس بیماری کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکے گا اور آسانی سے اسے غالب نہیں ہونے دے گا۔ وہ تمام عمر لڑتا رہا اور وہ اب بھی بیماری کے خلاف لڑنے کے لئے تیار تھا۔

اس نے ڈاکٹر کے مشوروں پر عمل کرنا شروع کر دیا اور جب بھی اس کی صحت نے اجازت دی اس نے اپنے نصب العین کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ وہ کبھی کبھی تازہ ہوا میں چلا جاتا اور اس طرح اس کی صحت قدرے بہتر ہو گئی وقت گزرتا گیا لوئی مطمئن تھا کہ وہ بچوں کو پڑھا رہا ہے اور اپنے حروف تہجی کے کام کو آگے بڑھا رہا ہے۔ سکول کا ڈائریکٹر پگنیر اس کے ساتھ تھا۔ ڈاکٹر پگنیر نے لوئی کے حروف تہجی پر ایک کتاب لکھی اور اسے اہم لوگوں تک پہنچایا سوائے حروف تشکر کے اور کچھ کہیں سے نہیں ملا۔

ایک دن لوئی اپنے گاؤں COUPVARY جا رہا تھا وہ ایک کوچ میں بیٹھا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے ساتھ ایک نابینا خاتون بیٹھی ہے۔ اس نے اسے حروف تہجی کے بارے میں بتایا۔ خاتون بہت خوش ہوئی اور اس نے یہ حروف تہجی سیکھنے کا وعدہ کیا۔ اس

نے یہ وعدہ پورا کیا یا نہیں۔ اس کے بارے میں تو لوئی کو کچھ معلوم نہ ہو سکا لیکن اسے یہ احساس تھا کہ اس کے حروف تہجی کس طرح اس طرح کی لاکھوں نابینا خواتین تک پہنچیں گے۔

لوئی کبھی کسی سے زیادہ باتیں نہیں کیا کرتا تھا لیکن اب جو بھی کوئی ملتا وہ اپنے اس طریقہ تحریر کے بارے میں بتاتا۔ شاید کوئی اس کی مدد کو تیار ہو جائے لیکن اسے تسلیوں کے سوا کچھ نہیں ملتا تھا اور کبھی کبھی وہ چیخ اٹھتا اسے احساس تھا کہ اس کے پاس بہت ہی کم وقت ہے۔ ابھی وہ اپنی عمر کی چوتھی دہائی ہی میں تھا لیکن جس بیماری میں وہ مبتلا تھا وہ بہت ہی خطرناک تھی اسے پھر بھی اس کی کوئی پرواہ نہ تھی لیکن اسے زندگی کا بڑا دھچکا اس وقت لگا جب 1841ء میں ڈاکٹر پگنیر سکول سے چلا گیا اور اس کی جگہ ڈاکٹر ڈوفا DUFAU نے سنبھال لی۔ جو کہ بالکل مختلف آدمی تھا۔ سرد مہر، کرخت، جو تبدیلیوں کے بالکل خلاف تھا۔ اس نے لوئی کے حروف تہجی کو رد کر دیا۔ اور اسے ایک احمقانہ عمل بتایا۔ شروع شروع میں تو اس نے بچوں کو اسے استعمال کرنے دیا لیکن پھر بالکل منع کر دیا۔ ادھر لوئی کی صحت خراب تر ہونے لگی اور وہ سکول سے اپنے گھر چلا گیا۔ اسے یقین تھا کہ وہ واپس ضرور آئے گا۔ لیکن اس کے دوستوں کو اس کا یقین نہیں تھا۔ لیکن لوئی واپس آ گیا۔ اس کی صحت قدرے بہتر ہو گئی لیکن یہ قلق کہ اس کے حروف تہجی کو بالکل نظر انداز کیا جا رہا تھا اسے کھائے جا رہا تھا اس کی کتابوں کا کیا بنے گا؟ کیا اس کی کوششیں اکارت جائیں گی۔ اس کی شبانہ روز کی کاوشیں لاحاصل ثابت ہوں گی۔ اس کے دکھ کی کوئی انتہا نہ رہی جب اسے بتایا گیا کہ اس کی تمام کتب اس کی عدم موجودگی میں نذر آتش کر دی گئی ہیں۔ اب زندگی ڈراؤنا خواب بنتی جا رہی تھی۔ اس کا جسم ٹوٹ پھوٹ رہا تھا اور اس کی روح جل رہی تھی لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ نابینا بچے اس کی کتابوں کو خفیہ طور پر استعمال کرتے رہے۔ بڑے بچوں نے چھوٹے بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا۔

انہیں معلوم تھا کہ یہی ان کی منزل ہے۔ کچھ اشخاص کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ اگر نابینا بچوں نے یہی روش جاری رکھی تو وہ پڑھنے میں خود کفیل ہو جائیں گے۔ انہیں بینا اساتذہ سے پڑھنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی تو ان کے روزگار کا کیا بنے گا۔ تمام سکولوں میں نابینا اساتذہ پڑھانے لگیں گے مگر ادارے کا ایک استاد ڈاکٹر جوزف لوئی کے حروف ابجد میں دلچسپی لینے لگا اسے لوئی کا انداز قابلِ عمل محسوس ہونے لگا۔ ڈاکٹر ڈوفا بھی محسوس کرنے لگا کہ وہ اس انداز تحریر کو ختم نہیں کر سکے گا اور پھر اسے یہ احساس دلوایا گیا کہ اگر لوئی کا طریقہ مشہور ہو گیا تو یہ سکول مشہور ہو جائے گا اور سکولوں کی مشہوری سے اس کی اپنی مشہوری بھی ہو گی اور اس طرح ڈاکٹر ڈوفا نے اپنی مخالفت ختم کر دی اور بچے آزادی سے لوئی کے حروف تہجی استعمال کرنے لگے۔

اس طرح طریقہ تحریر کو روشناس کرانے کے لئے ایک فنکشن کا اہتمام کیا گیا لیکن یہ اہتمام سکول کی نئی بلڈنگ میں ہونا قرار پایا۔ 1844 ء میں اس فنکشن کا انعقاد ہوا۔ شہر کے عمائدین کو دعوت دی گئی۔ بہت سے اساتذہ، سائنس دان حکومتی اہلکار اور ممتاز شہری تقریب میں شریک ہوئے۔ بہت سی تقاریر کی گئیں اور پھر لوئی کے حروف تہجی کی وضاحت کے لئے تقریر ہوئی۔ لوگ اس طریقہ حروف تہجی پر یقین نہیں کر سکتے تھے۔ ڈاکٹر ڈوفا نے ایک نابینا بچی کو سٹیج پر بلایا۔ بڑی بڑی بھوری آنکھوں والی لڑکی اسٹیج پر آئی۔ سامعین کچھ خاموش ہوئے۔ ڈاکٹر ڈوفا نے ایک کتاب کھولی اور پڑھنا شروع کر دیا اور نابینا لڑکی نے حروف تہجی لکھنا شروع کیے۔ پھر وہ لڑکی کتاب پر انگلیاں پھیرنے لگی اور سب لکھا ہوا پڑھ کر سنا دیا۔ سامعین مبہوت ہو گئے۔ کچھ نے خوشی سے تالیاں بجانا شروع کر دیں۔ کچھ کی آنکھوں کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ "یہ تو کوئی چکر ہے" کسی نے کہا" وہ رٹا ہوا سنا رہی ہے" ایک اور شخص بولا۔ یہ سن کر لوئی ڈاکٹر ڈوفا کے پاس پہنچا اور اس کی اجازت سے سامعین سے مخاطب ہوا۔ اس نے کہا جو کچھ وہ دیکھ رہے تھے وہ دھوکا نہیں بلکہ ایک

منضبط طریقہ سے دو نابینا بچوں کو اسٹیج پر بلایا گیا اور پھر ان میں سے ایک کو بھیج دیا گیا۔ ڈاکٹر ڈوفا نے حاضرین میں سے کسی کو اسٹیج پر آنے کے لئے کہا۔ جب ایک صاحب اوپر آئے تو ڈاکٹر موصوف نے انہیں کوئی صفحہ کھولنے کے لئے کہا اور کہا کہ نابینا بچے کو کچھ لکھوائیں اور پھر دوسرا بچہ بلوایا گیا جس نے فوراً سب کچھ پڑھ دیا۔

اب کسی کو شک نہیں رہا تھا سامعین نے اتنی تالیاں بجائیں کہ لوئی کا سر فخر سے بلند ہو گیا وہ خوش تھا کہ اس نے اپنا مقصد حاصل کر لیا ہے۔

وقت گزرتا گیا لوئی تپ دق کے خلاف بھی لڑتا رہا کبھی کبھی وہ بہت بیمار ہو جاتا۔ لیکن اسے پھر بھی امید رہتی کہ وہ پھر ٹھیک ہو جائے گا لیکن اس بار بیماری نے کچھ ایسا حملہ کیا کہ وہ پریشان ہو گیا۔ 1844ء میں لوئی نے بطور استاد کام کرنا ختم کر دیا ابھی اس کی عمر صرف 35 برس تھی لیکن وہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ صاحب فراش ہو گیا لیکن اسے خوشی کی یہ خبر ملی کہ اس کے حروف ابجد میں کتابیں تیار ہونے لگی ہیں۔ 1847ء میں پہلا بریل پرنٹنگ پریس قائم ہوا اور اب مشین کے ذریعے کتابیں تیار ہونے لگیں۔

لوئی اپنے کمرے میں لیٹا رہا اور اسے کچھ دوست ملنے آجاتے اور وہ انہیں دیکھ کر چہرے پر خوشیاں سجا لیتا۔ لوگ اس کی بہت تعریف کرتے لیکن اسے کبھی احساس تفاخر نہ ہوا۔ دسمبر 1851ء کا ایک مرطوب دن تھا لوئی کو زکام ہو گیا اور وہ بہت کمزوری محسوس کرنے لگا اسے بخار نے بھی آلیا۔ اس کی کھانسی شدید ہو گئی اس کے دوستوں نے اسے یقین دلایا کہ وہ ٹھیک ہو جائے گا لیکن وہ بہت افسردہ تھا اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اب وہ موت کے بہت قریب ہے۔ وہ موت سے نہیں ڈرتا تھا لیکن اسے زندگی سے بھی محبت تھی کیونکہ زندگی ہی میں وہ اپنے کام کو آگے بڑھا سکتا تھا۔ لیکن لوئی کی زندگی تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ 6 جنوری 1852ء کو شدید بارش ہوئی۔ لوئی نے کھڑکی کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا اور پھر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں پھر کبھی نہ کھولنے کے لئے۔ اس کے

دوستوں کو بہت افسوس ہوا لیکن وہ مشہور آدمی نہیں بن سکا تھا۔ پیرس کے کسی اخبار نے اس کی موت کی خبر شائع نہیں کی۔ لیکن آج وہ ہر جگہ جانا جاتا ہے جہاں بریل کی روشنی ہے وہیں وہ روشن ہے۔

لوئی ایک سادہ سا معلم تھا اس کے پاس دولت نہیں تھی لیکن آج جانے کتنے لوگ اس کے لئے سراپا سپاس ہیں۔

جب لوئی چل بسا تو آہستہ آہستہ اس کے چراغ کی لو تیز ہونے لگی ہر نابینا بچہ اور بچی بریل سیکھنے لگا۔ ہر زبان بریل میں لکھی جانے لگی۔ لوئی کی موت کے چھ ہی سال بعد امریکہ کے ایک سکول نے اس کے حروف ابجد استعمال کرنا شروع کر دیئے۔ اگلے 30 سال میں یورپ میں یہ طریقہ مروج ہو گیا۔ لوئی کا نام پوری دنیا میں مشہور ہو گیا۔ سکولوں میں اور جرائد کے نام اس کے نام پر رکھے جانے لگے۔ انسائیکلوپیڈیاز میں اس کا ذکر ہونے لگا۔ ٹکٹوں پر اس کی تصویر چھپنے لگی۔

جب لوئی نے 1852ء میں وفات پائی تھی تو پیرس کے کسی اخبار نے بھی یہ خبر شائع نہیں کی تھی لیکن سو 100 سال کے بعد 1952ء میں دنیا کے تمام اخباروں نے اس کی جدوجہد کی کہانیاں جلی سرخیوں کے ساتھ چھاپیں اور اس کی لاش جو اس کے گاؤں میں مدفون تھی پیرس لائی گئی اور اسے ایک عمارت PANTHEON میں دفنایا گیا جہاں فرانس کی مشہور شخصیات مدفون ہیں۔ اب فرانس اور دنیا اسے سلام کہہ رہی تھی اور اس کی 100 ویں برسی پر جوش طریقے سے منائی گئی جس میں صدر فرانس نے بھی شرکت کی اور ہیلن کیلر بھی فرانس پہنچیں اور جگہ جگہ سے نابینا افراد اپنے محسن کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے آئے جس نے ان کو کتابوں کی بیش بہا دولت سے نواز دیا تھا۔

